جلد 6 شمارہ 3 مئی 2004ء ربیع الاول 1425ھ

قد افلح من تزکی ○ وذکر اسم ربہ فصلی ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا

صداقت — اللہ — محبت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاح آدمیت گوجرانوالہ

Registered

CPL No. 4

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت، جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

اغراض و مقاصد

- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول ﷺ، کثرت ذکر، مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی ترویج و فروغ دینا۔
- کشف و کرامات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب و عرفان اور اسکی رضا و لقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا۔
- حضور ﷺ کے صحابہ کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج۔
- موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر سہل العمل اوراد و اذکار کی تلقین۔
- غصہ و نفرت، حسد و بغض، تجسس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم و رضا، عالمگیر محبت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا، تزکیہ نفس و تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل و عیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا۔
- اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا۔ مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے عادات و اخلاق کی اصلاح کرنا۔

عالمگیر محبت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا علمبردار

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ماہنامہ

آدمیت

فلاح

گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان

کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادگار **خواجہ عبدالحکیم انصاری**ؒ

بانی سلسلہ

نگران و سرپرست

محمد صدیق ڈار صاحب توحیدی

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 6 شمارہ 3 مئی 2004ء ربیع اوّل 1425ھ

ایڈیٹر **وحید احمد**

قیمت ——— -/20 روپے ——— سالانہ فنڈ ——— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:

محمد صدیق ڈار توحیدی

مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:0431-862835

Mob: 0320-5793520

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:

وحید احمد

تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

Ph:0431-881379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج الدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020

E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

اداریہ

گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی عید میلاد النبی بڑے جوش وخروش سے منائی گئی۔ بڑے بڑے جلوس نکالے گئے۔ سیرت کے موضوع پر جلسے کئے گئے اور بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی لیکن ان سب کاموں کے باوجود ہمارے معاشرے میں انارکی میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے معاشرے کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ اخلاقی بدحالی میں ہم دنیا کی تمام قوموں کو پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ یہ اخلاقی گراوٹ ہماری قوم کے ہر طبقے میں اس حد تک سرایت کر چکی ہے کہ احساس گناہ ختم ہو چکا ہے۔ ہونا تو چاہیے کہ ہم ہر سال اس مبارک موقع پر اپنے محسن اعظم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اپنا احتساب کریں۔ یہ دیکھیں کہ جس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے میں آپ کو بے شمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اس کو ہم نے کس حد تک سمجھا اور کتنا عمل کیا۔ لیکن اس طرف عموماً ہمارا دھیان نہیں جاتا۔ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ سارا سال جو کچھ مرضی کریں بس ایک محفل میلاد کرالیں ہماری بخشش کیلئے یہ کافی ہے۔ یہ انتہائی سنگین غلط فہمی ہے۔ اس نے ہماری قوت عمل کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس غلط فہمی کے پیدا کرنے کا ذمہ ہمارا حقائق سے فرار اور علماء کرام کا غیر ذمہ دارانہ رویہ ہے۔ عام مسلمانوں کو علماء کرام نے یہ باور کروایا ہے کہ ایسی محافل کا انعقاد ہی انکے لئے ذریعہ نجات ہے۔ جو یہ اہتمام نہیں کرتا وہ راندۂ درگاہ ہے۔ ویسے بھی ہمارا مجموعی قومی رویہ حقائق سے چشم پوشی پر مبنی ہے۔ ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ اصل خرابی کیا ہے اور کہاں ہے اس کو دور نہیں کرتے یا اپنی نفسانی خواہشات کے ہاتھوں یرغمال بن کر خرابی کو جوں کا توں رہنے دیتے ہیں۔ دین کا ہماری روزمرہ زندگی میں عمل دخل محض رسمی سا رہ گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کو محض رسماً ادا کرتے ہیں۔ اس سے انسانی زندگی میں کیا تبدیلی آنی چاہیئے اور ہمارے معاشرے میں اس کے کیا اثرات ہونے چاہئیں یہ موضوع قابل توجہ نہیں رہا۔ یہی حال ہمارے تہواروں کا ہے۔ ہم مجموعی طور پر تفریح پسند واقع ہوئے ہیں۔ تہوار چاہیے کسی قسم کا ہو ہم اس میں تفریح

تلاش کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ عید میلاد کو بھی تفریحی انداز میں منانے کے نت نئے طریقے ہر سال سامنے آتے رہتے ہیں۔ اگر ہم ان تفریحات سے قومی سوچ اخذ کرنا چاہیں تو ایسی سوچ دین حق کی بدنامی کا باعث ہوگی۔ عید میلاد النبی کو تو ایک ریفریشر کورس کی طرح ہونا چاہیے۔ جس میں ہر سال ہم اپنے اقوال و افعال کا جائزہ سیرت رسول کی روشنی میں لیں۔ یہ دیکھیں کہ صراط مستقیم پر ہم کس حد تک چل سکے ہیں اور آئندہ زندگی کو بہتر انداز میں چلانے کیلئے کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ جب تک اسی طور پر اس دن کو مناتے رہیں گے اس کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ الٹا نقصان اٹھائیں گے۔ جب تک ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر حضور کی اطاعت نہیں کرتے اس وقت تک ہم امت وسطیٰ کا کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ اللہ تمام مسلمانوں کو اپنی اور اپنے حبیب کی سچی محبت عطا فرمائے آمین

والسلام وحید احمد

محاسن اور معائب اخلاق

خولجہ عبدالحکیم انصاری

اصلاح

اپنے افراد یا جماعت کی اصلاح کرنا سب سے بڑی نیکی اور ذمہ داری کا کام ہے۔ اس کام کے لئے بے انتہا قابلیت اور خود نیک ہونے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ (ترجمہ) ''لازم ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے'' (آل عمران)۔ لیکن ہماری بدنصیبی کہ یہ کام بھی ہر شخص نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے خود کچھ جانتے نہیں نیک و بد کو پہچانتے نہیں مگر جہاں کسی میں بزعم خود کوئی برائی دیکھ (خواہ وہ حقیقت میں برائی نہ ہو) لگے اس کو نصیحت کرنے۔ اس کے لئے نہ کوئی موقعہ و وقت دیکھتے ہیں، نہ حالات و ماحول، راستہ چلتے بازار اور سڑکوں پر بسوں میں، ٹریم کاروں میں، ریل گاڑیوں میں الغرض ہر جگہ ان ناصحان مشفق کی زبانیں آپ کو قینچی کی طرح چلتی نظر آئیں گی۔ پھر نصیحت کرنے کا طریقہ اس قدر بھونڈا اور مکروہ ہوتا ہے کہ جس کو نصیحت کی جا رہی ہے وہ نصیحت ماننے کی بجائے لڑنے جھگڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ نصیحت حکمت آمیز پیرائے اور خوش ترین الفاظ میں کی جائے۔ لیکن اس حکم کی مطلق پروا نہیں کی جاتی۔ اسی لئے جھگڑا اور فساد برپا ہوتا ہے آج کل تو لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ تم میں فلاں نقص ہے تو وہ سر توڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جب کسی کو نصیحت کرنی ہو تو اس کو ہرگز ہرگز برا نہ کہو بلکہ جو عیب اس میں ہے اس عیب کو برا کہو مثلاً جو آدمی جھوٹا، شرابی یا زانی ہے۔ مناسب موقعہ و محل دیکھ کر اس کے سامنے جھوٹ، شراب اور زنا کی برائی اور نقصان ایسے موثر الفاظ میں بیان کرو کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہے لیکن اس طریقے کا اثر صرف اسی حالت میں ہوگا جب کہ وہ تمھارے حسن اخلاق کا پہلے سے گرویدہ اور تمہاری بات ماننے کو تیار ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو نیکیوں کی دعوت دے اور برائیوں سے روکے تو ظاہر ہے کہ یہ گروہ صرف علمائے دین ہی کا ہو سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے

ہمارے ہاں صحیح معنوں میں علمائے دین اس قدر کم ہیں کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ہر شخص جو چند کتابیں حدیث وفقہ کی پڑھ کر اور کچھ بے سروپا حکایتیں اور روائتیں یاد کر کے کسب معاش کی خاطر وعظ ونصیحت کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے۔ عالم دین سمجھا جاتا ہے ایسے خودساختہ اور پیشہ ور علماء بجائے فائدے کے سخت نقصان پہنچاتے اور بجائے اصلاح کے قوم میں فساد برپا کرتے ہیں۔ انہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''جب ان کو کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کر رہے ہیں'' قوم کے مختلف فرقوں میں عناد ومنافرت پیدا کرنے کے ذمہ دار اسی قسم کے علماء ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت کا اختلاف باعث رحمت ہوگا۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ اگر اختلاف خلوص اور نیک نیتی پر مبنی ہو اور اس میں عناد ومنافرت کے جذبات کام نہ کر رہے ہوں تو ایسے اختلاف پر بحث وتمحیص سے اجتہاد کی راہیں کھلتی ہیں۔ حق آشکارا اور دین کی خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے تمام فرقوں کے اختلافات اصولی مطلق نہیں محض فروعی ہیں۔ اللہ، رسولؐ اور قرآن کو سب ہی سچا جانتے ہیں۔ اس صورت میں اگر ایک فرقہ دوسرے پر لعن طعن نہ کرے، ان اختلافات پر صبر کرے اور ہر فرقہ کے فروعی عقائد کو ان کے نجی عقائد سمجھ کر درگزر کرے یا شرافت واخلاق کے ساتھ بحث ومباحثہ بھی کر لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ پیشہ ور علماء اپنی جیبیں پر کرنے کے لئے مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے اور ملت کی عام تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ ہماری رائے میں اس مصیبت کا واحد علاج یہ ہے کہ ہر اسلامی حکومت دو کام کرے ایک تو یہ کہ تمام مذہبی مدارس کی نگرانی اپنے ذمے لے لے اور ان مدارس کے ہر فرقہ کے علماء سے ایسے نصاب مقرر کرائے کہ طلباء اپنے فروعی اختلافات پر قائم رہتے ہوئے بھی باہمی منافرت سے باز رہنا سیکھیں۔ دوسرے یہ کہ کسی فرقے کے کسی عالم کو پبلک یا پرائیویٹ جلسوں میں اس وقت تک تقریر کرنے یا وعظ کہنے کی اجازت نہ ہو جب تک وہ گورنمنٹ سے اس مقصد کے لئے باقاعدہ لائسنس حاصل نہ کر لے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس طریقہ کے نفاذ پر قیامت برپا ہو جائے گی لیکن یہ غل وشور مچانے والے وہی لوگ ہونگے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ملت میں فرقہ وارانہ تعصب اور منافرت پیدا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن اتحاد ملت کا مقصد اس

قدر عظیم اور اہم ہے کہ اس بارے میں حکومتوں کو کسی کی بھی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس اصلاح سے ہماری مراد صرف جماعتی اور اجتماعی اصلاح ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو برائیوں سے روک ہی نہیں سکتا، اور نیکی کی دعوت دے ہی نہیں سکتا۔ بے شبہ ہر مسلمان کو یہ حق ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو نیکی کی دعوت دے اور برائی سے روکے۔ لیکن یہ کام صرف ان آدمیوں کو کرنا چاہیے جو اس کے اہل ہوں۔ اور نصیحت کرنے کا طریقہ جانتے ہوں۔ حکمت اور خوبی سے یہ کام انجام دے سکیں فساد برپا نہ کریں۔

انصاف

جس آدمی میں انصاف کا مادہ نہ ہو اس میں تعصب پیدا ہو جائے گا۔ اور جس میں تعصب ہوگا وہ حق بینی سے محروم رہ جائے گا۔ جو سراسر گمراہی اور خسران ہے۔ اگر کسی قوم کی اکثریت ایسی ہو تو وہ کبھی تباہی سے نہ بچ سکے گی۔ اس لئے اپنا اور قوم کا بھلا چاہتے ہو تو ہمیشہ انصاف کرو۔ انصاف کیا ہے؟ یہ کہ تم پر منصبی معیشی اور معاشرتی اعتبار سے لوگوں کے جتنے بھی حقوق عائد ہوتے ہیں سب کو اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق ادا کرو۔ چونکہ ادائیگی حقوق کا پورا بیان پیچھے ہو چکا ہے۔ یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔

انتقام اور معافی

اگرچہ اللہ نے انتقام اور قصاص لینے کا حکم دیا ہے لیکن اس کا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ تم خود قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔ جس نے تمہارا دانت توڑا اس کا دانت توڑ دو۔ جس نے تمہاری آنکھ پھوڑی ہے اس کی آنکھ پھوڑ دو۔ یا جس نے تمہارے کسی رشتہ دار کو قتل کیا ہے اس کو قتل کر دو۔ اگر ایسا ہونے لگے تو قوم و ملک کا سارا امن و انتظام دو دن میں درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اور وہ فساد پھیلے کہ خود قوم کا بھی نام و نشان باقی نہ رہے۔ اس لئے اللہ اور رسول ﷺ نے یہ کام قاضیوں یعنی ججوں اور مجسٹریٹوں کے سپرد کیا ہے کہ وہ مظلوموں کی دادرسی کر کے مجرموں کو سزا دیں۔ اکثر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس قسم کے قصوروں کا نہیں تو کم از کم چھوٹی موٹی باتوں کا بدلہ تو ہم خود لے سکتے ہیں۔ مگر یہ خیال بھی غلط ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی تم کو گالی دیتا یا تمہارا کچھ مال چرا لاتا ہے تو کیا جواب میں تم بھی اس کو گالی دو گے یا اس کا مال چرا لو گے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی

اسی جرم اور گناہ کے مرتکب ہو گے جو اس نے کیا ہے اور اسی سزا کے مستحق ٹھہرو گے جس کا ...
ہے۔ اگر اس طرح برائی اور گناہ کو جائز قرار دے دیا جائے تو نیکی کا نام بھی باقی نہ رہے
مسلمانوں کی قومی تباہی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ برائی کے بدلے برائی کو جائز سمجھتے ہیں ...
یہ تو یاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک،
کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور زخموں کے بدلے ایسے ہی زخم لگانے کو
قرار دیا ہے لیکن اسی آیت کا اگلا ٹکڑا ان کو یاد نہیں رہتا کہ اگر مظلوم معاف کر دے تو یہ اس کے
گناہوں کا کفارہ ہوگا"۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس سے بڑی جزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کے ...
معاف ہو جائیں اور مرنے کے بعد ان کی سزا نہ بھگتنی پڑے۔ پھر اس ٹکڑے کے بعد یہ بھی ہے کہ
"جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق حکم نہ دیں، وہ بے انصاف ہیں"۔ (سورۃ مائدہ۔ آیت ۴۹)
آیت کے اس آخری ٹکڑے سے صاف ثابت ہو گیا کہ تم کو خود مجرم سے جرم کا بدلہ اور قصاص لینے
کا حکم نہیں ہے بلکہ یہ کام قاضیوں کا ہے جو سزا کا حکم دیں گے۔

اس کے علاوہ سورۃ مومنون میں یوں ارشاد ہوتا ہے "اے پیغمبرؐ برائی کو بھلائی سے دفع کرو۔
ہم خوب جانتے ہیں کہ تمہارے مخالفین کیا صفات بیان کرتے ہیں"۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو
لوگ تمہارے منہ پر یا پیٹھ پیچھے تمہیں برا کہیں تو جواب میں نیکی سے پیش آؤ۔ پھر اس سے بھی
زیادہ صاف سورۃ حم سجدہ میں فرماتے ہیں کہ "برائی اور بھلائی برابر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے برائی کا
جواب بھلائی سے دو تا کہ تمہارا اعدو مثل تمہارے دوست اور رشتہ دار کے ہو جائے"۔ اس سے
زیادہ بلند اخلاقی اور کیا ہو سکتی ہے۔ دن رات کا تجربہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ ہمیشہ برائی
کرتا رہے اور تم جواب میں ہمیشہ نیکی سے پیش آتے رہو، تو آخر میں وہ شرمندہ ہو کر تمہارا دوست
اور محب بن جائے گا۔ ان صاف صاف احکام کے باوجود ہمارے افراد ہی نہیں بلکہ ملت کے بعض
طبقات بھی انتقاماً قانون کو ہاتھ میں لینا مذہباً جائز سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے سرحدی اور
قبائلی پٹھانوں ہی کو لیجئے۔ ان کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو مقتول کے وارث
موقعہ ملتے ہی قاتل کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ اور اگر اتفاق سے قاتل بچ جائے تو مقتول کی اولاد نسلاً
بعد نسل اس کے خون کا بدلہ لینے کی فکر میں لگی رہتی ہے اور جب بھی موقعہ ملتا ہے قاتل کی اولاد در

اولاد میں سے کسی نہ کسی کو قتل کر کے دم لیتی ہے۔ اب اس نئے قتل پر یہ ہوتا ہے کہ مقتول نمبر ۲ کی اولاد اس کے خون کا بدلہ لیتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قتل و خون ریزی کا یہ سلسلہ ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پٹھان عام طور پر ہتھیار باندھے بغیر گھر سے باہر نہیں جاتے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت دشمن کا سامنا ہو جائے۔ یہ صورت حالات جس قدر غیر مہذب غیر اسلامی اور قومی ترقی کے لئے تباہ کن ہے ظاہر ہے۔ لیکن پٹھان اپنی علمی اور مذہبی جہالت کی وجہ سے اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں رکھتے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ رسم ان کی مسلمہ بہادری کے دامن پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اس سے ان کی بہادری ہی نہیں غیرت بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے کیونکہ اس قسم کے انتقام کبھی بھی مقابلہ اور چیلنج کر کے نہیں لئے جاتے بلکہ جب بھی موقعہ ملتا ہے بدلہ لینے والے بے خبری میں پیچھے سے گولی چلا کر مخالف کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی بہادری اور غیرت نہیں کہلائی جاسکتی اس رسم کی وجہ سے پٹھان ہی نہیں اسلام بھی تمام دنیا میں بدنام ہو رہا ہے اور ہو چکا ہے۔ غیر مسلم اقوام پروپیگنڈا کرتی ہیں کہ پٹھانوں میں اس قسم کی وحشت و بربریت اسلامی تعلیم کی وجہ سے ہے۔ اس لئے قوم و مذہب کا درد رکھنے والے پٹھانوں کا فرض ہے کہ حکومت کی مدد سے اس صورت حال کو جلد از جلد ختم کر دیں۔ اور اپنی خداداد قوتوں سے کام لے کر دوسری متمدن اقوام کے دوش بدوش کھڑے ہو جائیں۔ اور یاد رکھیں کہ انتقام کا یہ طریقہ انتہائی وحشیانہ اور گناہ کبیرہ ہے۔ جس شخص نے تمہارے باپ دادا کو قتل کیا تھا اگر وہ سزا سے بچ گیا تو تم اس کے بیٹے یا پوتے سے بدلہ نہیں لے سکتے کیونکہ وہ تو بے گناہ ہے نہ قتل کا ذمہ دار ہے نہ خود قاتل۔

تجسس اعمال اور بدگمانی

سورۃ حجرات میں ارشاد ہوتا ہے ''اے ایمان والو بات بات پر بدگمانی نہ کیا کرو کیونکہ اکثر بدگمانیاں گناہ ہیں۔ اور ایک دوسرے کے افعال کی جستجو میں نہ رہا کرو''۔ لیکن باوجود ان صاف احکامات کے اکثر مسلمان اس قبیح عادت میں مبتلا ہیں۔ بدگمانی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دل ہر وقت برائی کی طرف مائل رہتا ہے اور رفتہ رفتہ برائی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ ایسے دل میں نیکی قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ ایسے آدمیوں کا اخلاق بہت ہی گندہ ہوتا ہے۔ بدگمانیاں

آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور حق بینی سے محروم رکھتی ہیں جس سے بعض مرتبہ نقصان عظیم پہنچتا ہے۔ ایک سچا واقعہ ہے کہ ایک شخص جو فوجی ملازم تھا کسی ٹریننگ کے لئے چھ ماہ کے واسطے انگلستان گیا اور بیوی کو اکیلا گھر پر چھوڑ گیا۔ جب واپس آیا تو کسی وجہ سے بیوی پر بدگمانی پیدا ہوئی اس ٹوہ میں رہنے لگا کہ اس کی کوئی حرکت بچشم خود دیکھے۔ مکان کے دو دروازے تھے ایک دن پچھلے دروازے سے مکان میں داخل ہوا۔ بیوی دوسرے دروازے پر کھڑی کسی سے باتیں کر رہی تھی، چھپ کر سننے لگا۔ ایک فقرہ جو آخر میں صاف طور پر سنا یہ تھا ''کل آنا کل دونگی'' یہ سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ غصہ کے مارے عقل جاتی رہی پستول لگا ہوا تھا، فائر کیا غریب عورت وہیں ڈھیر ہو گئی۔ دوسرے دن شام کو ایک فقیر آیا، گھر پر بھیڑ تھی ایک آدمی سے کہا بی بی جی سے کہنا وہ فقیر آ گیا ہے اس نے جواب دیا کہ بی بی جی تو مر گئی۔ سن کر بہت رنجیدہ ہوا کہنے لگا، بڑی ہی نیک بی بی تھی کبھی سائل کو گھر سے خالی نہ جانے دیتی تھی مجھے ہمیشہ خیرات دیتی تھی کل میں آیا تو کل بھی کچھ پیسے دیئے تھے، میں نے پہننے کے لئے کپڑا مانگا تو وعدہ کیا کہ کل آنا کل دونگی۔ لوگ مجرم کے منہ سے یہ فقرہ پہلے ہی کئی بار سن چکے تھے، فقیر کو ٹھہرا لیا۔ اس کا پتہ لکھا اور کورٹ مارشل میں بطور گواہ پیش کیا۔ مجرم کو پھانسی کی سزا ہوئی جو بعد میں نو برس کی قید بامشقت میں تبدیل ہو گئی۔ دیکھا آپ نے بدگمانی کا ثمرہ کس طرح بنا بنایا گھر تباہ ہو گیا۔ اس لئے جب تک بچشم خود نہ دیکھ لو ہرگز کسی کے متعلق بری رائے قائم نہ کرو۔ اور بچشم خود دیکھنے کے بعد بھی پردہ پوشی کرو، اللہ بھی تمہارے عیبوں کی پردہ پوشی کرتا ہے ہاں عدالت میں گواہی دینی پڑے تو بالکل سچی بات بیان کرو۔ وہاں کسی کے جرم کو چھپانا گناہ ہے۔ بدگمانی یہ بھی ہے کہ تم کسی کے متعلق یہ فرض کر لو کہ وہ تمہارا بدخواہ ہے یا تم کو ذلیل سمجھتا ہے۔ ایسی بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تم بھی اس کو ذلیل سمجھنے لگتے ہو اور اس کے بدخواہ بن جاتے ہو۔ اس طرح دلوں میں اکثر اوقات بے وجہ فرق پڑ جاتا ہے اور جماعت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے اس برائی سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جس کے متعلق تمہارے دل میں ایسی بدگمانی پیدا ہو خود اس سے صاف صاف بیان کرو۔ تا کہ دل صاف ہو جائیں۔ اور اگر تمہارا خیال صحیح ثابت ہو تو برا نہ مانو۔ اپنے اخلاق کی طاقت سے اپنے مخالف پر فتح حاصل کرو اور اس کو اپنا بنا لو۔ یاد رکھو نفرت کو نفرت سے نہیں محبت سے ہی فتح کیا جا سکتا ہے۔

اصلاح اخلاق کی ضرورت

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

ہمارے مسائل

پاکستان میں بہت سے مسائل ہیں جو جلد یا بدیر اپنا حل چاہتے ہیں۔ ان میں کچھ اندرونی ہیں اور کچھ بیرونی۔ بیرونی مسائل میں امن عالم بین الاقوامی ساکھ، باہمی خوشگوار روابط، اور مسئلہ کشمیر وغیرہ ہیں۔ اور اندرونی مسائل میں تعلیم، صحت عامہ، آبادی پر کنٹرول، غذائیات کی فراوانی، روزگار کی فراہمی، رہائشی مکانات کا اہتمام، عائلی خوشگواریاں اور باہمی معاشرتی تعلقات اور سب سے بڑھ کر قلبی راحت وسکون وغیرہ ہیں۔ ان میں ہر مسئلہ اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور کوئی بھی نظر انداز کئے جانے کا مستحق نہیں۔ عوام اور حکومت ان سب مسائل کو بقدر استطاعت حل کرنے میں کوشاں ہیں۔ یہ سارے مسائل دراصل ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ ایک کی بہتری سے دوسرے کی بہتری وابستہ ہے۔ اور ایک کا فساد دوسرے کے لئے باعث فساد ہے۔ مسائل معاشی ہوں یا معاشرتی، سیاسی ہوں یا تعلیمی، ذہنی ہوں یا روحانی سب ہی ایک دوسرے سے جڑے اور گتھے ہوئے ہیں اور ایک کے حل سے دوسرے کے حل کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

سب سے زیادہ مستحق توجہ

ہماری نگاہ میں اس وقت سارے مسائل ہیں لیکن بہت زیادہ اہم جو مسئلہ ہے وہ اخلاقی ہے اور یہ ہماری فوری اور پوری توجہ کا مستحق ہے۔ بلکہ یوں کہیے اسی کی اصلاح پر دوسرے کئی مسائل کا حل منحصر ہے۔ ہم نے صنعتوں میں ترقی کی ہے، تجارت کو فروغ دیا ہے، تعلیم بھی پھیل رہی ہے، صحت عامہ کی طرف ایک حد تک کامیاب توجہ دی جارہی ہے۔ ہماری بین الاقوامی ساکھ بھی پہلے سے زیادہ وزنی ہوگئی ہے۔ تعمیرات کا سلسلہ بھی روز افزوں ترقی پر ہے۔ فوجی قوت میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن روحانی سکون، قلبی اطمینان اور ذہنی توازن کی بڑی کمی ہے۔ کیونکہ روحانی واخلاقی اقدار میں روز بروز انحطاط وتنزل ہوتا جارہا ہے۔

ہر روز کا اخبار دیکھ لیجئے

سال بھر کے اخبارات دیکھ جائیے، کسی تاریخ کا اخبار بھی ایسا نہ ملے گا جس میں ہمارے اخلاقی زوال کے متعدد نمونے موجود نہ ہوں، بیٹا باپ کے پیٹ میں چھرا گھونپ رہا ہے، شوہر بیوی کی ناک کاٹ رہا ہے، چچا چند گز زمین پر قبضہ کرنے کے لئے بھتیجے کو قتل کر رہا ہے، بیٹی ماں کو زہر دے رہی ہے، بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے، عورتوں پر مجرمانہ حملہ ہو رہا ہے، معمولی باتیں فتنہ وفساد کرنے کا سبب بن رہی ہیں، اور چند آنے کے جھگڑے کے نتیجہ میں کئی لاشیں تڑپتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے ایک دو واقعات نہیں سینکڑوں ہی واقعات ہیں جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں اور ہر روز کے اخبار اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اخلاقی تباہی کی انتہا یہ ہے کہ کہیں سیلاب آتا ہے یا آگ لگتی ہے یا گاڑی کا حادثہ پیش آتا ہے تو کچھ لوگ اس مصیبت سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور جو وقت خاص طور پر اعانت و ہمدردی کا ہوتا ہے اسی وقت وہ انتہائی شقاوت و بے دردی سے لوٹ مار کرنے لگتے ہیں۔ یہ اخلاقی گراوٹ کا وہ آخری زینہ ہے جس سے نیچے شاید اور کوئی درجہ نہیں۔ ہماری معاشی، صنعتی، اقتصادی، تجارتی اور تعلیمی ترقیاں کس کام کی جب اخلاقی تنزل کا یہ حال ہے؟

اہم ترین مقصد مملکت

ہم نے اسلام کے نام پر پاکستان لیا ہے۔ لیکن شاید ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اسلام محض مادی ترقیوں کا نام نہیں۔ اسلام کی ساری اساس ہی اخلاقی ترقی اور روحانی اقدار پر قائم ہے۔ صرف مادی ترقیاں ہی ہمارا مقصود نہیں۔ اسلامی قدروں کے مطابق زندگی گزارنا بھی ہمارا بنیادی مقصد ہے۔ ہمارے اور دوسری مملکتوں کے درمیان خط امتیاز کھینچنے والی شے صرف اسلام ہے۔ اور اسلامی اقدار اور اسلامی اخلاق کا تحفظ ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

مادی اور روحانی ترقی

اس سلسلے میں ایک نکتہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اخلاقی ترقی کے بغیر مادی ترقی ممکن ہی نہیں۔ آج اس وقت بھی جن قوموں کو آپ سربلند اور ترقی یافتہ دیکھ رہے ہیں دراصل ان کی ترقی اخلاقی

عالیہ ہی کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنے بچاؤ یا اپنی تسکین کے لئے جو کچھ چاہیں کہہ دیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ترقی یافتہ اقوام غیر معمولی اخلاق کی حامل ہیں اور ہم ان کے مقابلے میں تقریباً صفر ہیں۔ اس لئے یہ خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر دینا چاہیے چونکہ یہ ساری سربلند قومیں بدکردار ہیں اس لئے ہم اسی وقت سربلند و ترقی یافتہ ہوں گے جب ہم بھی بداخلاق ہو جائیں۔ اول تو یہ بات ہی غلط ہے کہ وہ بداخلاق ہیں۔ اور اس کے باوجود ترقی حاصل کر لی ہے۔ دوسرے بغرض محال اگر ایسا ہو بھی تو یہ بداخلاقی مسلمان قوم کو راس نہیں آسکتی۔ یہ فرق دراصل دو مزاجوں کا بنیادی فرق ہے۔ غیر مسلم بعض بداخلاقیوں کے باوجود ترقی کر سکتے ہیں، لیکن مسلمان قوم کا مزاج ہی ایسا واقع نہیں ہوا ہے۔ انہیں یہ طریقہ کبھی راس نہیں آسکتا اور فرض کیجئے راس آ بھی جائے تو یہ ہمارے مزاج کی افتاد اور بنیادی مقصد کے سراسر خلاف ہے۔ مسلمان کا تو مقصد حیات ہی اخلاقی اقدار کو اپنی زندگی میں سمونا اور اجاگر کرنا ہے۔

اخلاقی ترقی کے بغیر کوئی مادی ترقی نہیں ہوتی۔ اور اگر کسی نوع سے ہو بھی جائے تو وہ ترقی دنیا کے لئے ہلاکت و مصیبت بن جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ صرف اخلاقی گراوٹ ہوتی ہے۔ قرآن اس حقیقت کی تکرار سے بھرا پڑا ہے کہ جس قوم میں اخلاقی انحطاط پیدا ہوا وہ خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ ہو بری طرح تباہ و برباد ہوگئی۔ پس جب ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجہ کی سربلند قومیں بھی بداخلاقی کی وجہ سے برباد ہوگئیں تو ہم کس طرح مطمئن ہو کر بیٹھ سکتے ہیں جب کہ ہم ابھی مادی ترقیوں میں بھی دنیا کی دوسری اقوام سے بہت پیچھے ہیں؟

اخلاقی زوال کا نتیجہ

ہمیں اچھی طرح یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہمارے جتنے ملکی و قومی مسائل ہیں ان میں اس وقت سب سے زیادہ مستحق توجہ اخلاقی اصلاح ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس پر تمام دوسرے مسائل کا حل بھی موقوف ہے اگر یہ مسئلہ حل ہو گیا تو سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اور اگر خدانخواستہ یہی لاینحل رہا تو دوسرے سارے مسائل حل ہو کر بھی لاینحل سے بدتر ثابت ہونگے اور ہر ظاہری ترقی وبال جان بن جائے گی۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

مغرب اور مشرق کا ایک فرق

یہ صحیح ہے کہ اچھے برے بھی قوموں میں ہوتے ہیں لیکن فرق صرف کم وبیش کا ہوتا ہے۔ کسی قوم کی غالب اکثریت خوش کردار ہو تو اس قوم کو خوش کردار ہی کہا جائے گا اور اس خوش کرداری کا ثمرہ اسے دنیا میں مل کر رہے گا۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی اکثریت ہی بدکردار ہو تو اس کا شمار بدکردار قوموں میں ہوگا۔ ہماری ایشیائی مسلم قوموں میں بدقسمتی سے یہ روایت قائم رہی ہے کہ چند افراد اگر خوش کردار ہوتے ہیں تو اتنے بلند ہوتے ہیں کہ دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن غالب اکثریت ایسی ہوتی رہی ہے کہ بدکرداری میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ گویا دونوں طبقوں میں اتنی بڑی خلیج حائل رہی ہے کہ ہمارا کوئی نیشنل کیریکٹر نہیں بن پایا۔ بخلاف اس کے آپ دنیا کی تقریباً ہر قوم میں خصوصاً ترقی یافتہ اقوام میں خاص قومی کردار پائیں گے جو ان سب میں مشترک ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی اکثریت کی اخلاقی حالت بدرجہا بہتر ہے۔ ان میں برائیاں بھی موجود ہیں لیکن یقین کیجئے ان کی اکثر برائیاں ایسی ہیں جو ان کی نگاہ میں برائیاں نہیں ہیں۔ اور اگر کوئی انہیں یہ سمجھا دے کہ یہ واقعی برائیاں ہیں تو وہ سب سے پہلے ان کو ترک کر دیں گے۔ لیکن ہمارا حال اس سے بالکل مختلف ہے، ہم جن برائیوں کے متعلق اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ اللہ، رسولؐ، فقہا، علماء اور عام انسانوں کے نزدیک مسلمہ برائی ہے اسے بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ برائیاں پیدا ہونے اور برقرار رہنے کا ایک بہت بڑا سبب یہی طرز عمل ہے۔ قوم کی اخلاقی حالت کو درست کرنا ہمارا انفرادی اور اجتماعی فرض ہے۔ اور ان تمام گذارشوں کا ماحصل یہ ہے کہ ہم کو اپنی اولین فرصت میں اس کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ ہمارے اہم ترین مسائل میں بہت اہم اخلاقی اصلاح کا مسئلہ ہے اور یہ ہماری پہلی اور فوری توجہ کا مستحق ہے۔

آنحضرتؐ بحیثیت معلم و محرک تعلیم

جناب محمد مسعود صاحب

محمد رسول اللہ ﷺ جس قوم میں مبعوث ہوئے اس میں ایک طرف تو تعلیم کا رواج نہ تھا اور چند لوگ ہی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور دوسری طرف اس میں اعلیٰ ذہنی تربیت اور بلند اخلاقی قدروں کا، جس کے نتیجے میں انسانی اعمال کا رخ صحیح سمت کی طرف ہو جاتا ہے، تقریباً فقدان تھا۔ رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو آپؐ نے اپنی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ:

انما بعثت معلماً ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ اور **انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق** ''میں بھیجا گیا ہوں تاکہ بہترین اخلاق کی تکمیل کر سکوں''۔

آپؐ کی تعلیم کی نوعیت کیا تھی اسکی قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت سے بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

(ترجمہ) ''بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب کہ ان میں ان ہی میں سے رسول بھیجا جو ان کو اسکی آیات سناتا اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے'' 64:3

مندرجہ بالا آیت سے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے چار مقاصد واضح ہوتے ہیں جن سے کہ تعلیم و تربیت کے چار درجات متعین ہوتے ہیں۔ پہلا اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا یعنی اللہ کا کلام (پیغام) بعینہ لوگوں تک پہنچانا۔ دوسرا اس کلام (پیغام) کی تشریح کرنا، جس کی دو صورتیں ہیں! ایک زبانی اور دوسری عملی۔ تیسرا مقصد حکمت کی تعلیم دینا یعنی لوگوں میں یہ صلاحیت پیدا کرنا کہ ان کے اعمال صحیح رخ پر یعنی اللہ کی مرضی کے مطابق ہو جائیں۔ چوتھا مقصد تزکیہ کرنا یعنی انسانوں کی ذہنی تربیت اس انداز سے کرنا کہ ان کے جذبات مناسب حدود میں آ جائیں جس کے نتیجے میں ان میں اچھی خصلتیں مثلاً سخاوت، ایثار، صداقت وغیرہ پیدا ہو جائیں۔ اور بری خصلتیں مثلاً بخل، کینہ اور حسد وغیرہ دور ہو جائیں۔ مثال کے طور پر شجاعت ایک جذبہ ہے اس کا اظہار اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی بلاوجہ کسی کو چیلنج کرے اور اس سے لڑائی مول لے اور اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ میدان جنگ میں حق کے راستے میں دشمنوں سے جنگ کرے۔ موخر الذکر صورت میں جذبہ شجاعت کا اظہار تزکیے کی حدود میں آتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تین مرحلے تعلیم کے ہیں اور ایک تعلیم یعنی تزکیے کے لازم کی حیثیت سے ہے کیونکہ اگر تزکیہ نہ ہو تو علم بجائے مفید

ہونے کے انسانوں کے لئے مضر ثابت ہو سکتا ہے۔

آپؐ کے اصول تعلیم

آپؐ کے اصول تعلیم بھی تقریباً وہی تھے جو دوسرے انبیاء کے تھے۔ ان اصول پر علامہ شبلی نعمانیؒ نے امام رازیؒ اور ابن رشدؒ کے حوالے سے جو روشنی ڈالی ہے وہ مختصر طور پر یہ ہے۔

(ا) انبیاء کا مقصد عوام وخواص دونوں کی تعلیم و تربیت کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ عوام کے مقابلے میں خواص کی تعداد بہت کم ہوتی ہے، اس لئے انبیاء کا لوگوں سے خطاب کرنا اس انداز سے ہوتا ہے کہ وہ کم سے کم فہم وادراک رکھنے والے کے ذہن میں بھی آ سکے۔ البتہ ان کی گفتگو میں ایسے اشارات بھی ہوتے ہیں جو صرف خواص یعنی بلند عقل و شعور کے لوگوں کے لئے ہوتے ہیں۔

(ب) انبیائے کرام لوگوں سے ان کی اس عقل وفہم کے مطابق بات کرتے ہیں جو پیدائشی طور پر اکثر افراد میں پائی جاتی ہے۔ مراقبہ، مجاہدہ وغیرہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ انبیاء کے خطاب کا موضوع نہیں ہوتا۔ چنانچہ انبیاء نے یہ تکلیف نہیں دی کہ وہ خدا کو تجلیات، مشاہدات براہین اور قیاسات کے ذریعے پہچانیں۔

(ج) انبیاء کی تعلیم کا مقصد لوگوں کے اخلاق درست کرنا اور ان کے نفس کا تزکیہ کرنا ہوتا ہے۔ انبیاء اس کائنات میں رونما ہونے والے حادثات، واقعات اور سائنسی مسائل سے بحث نہیں کرتے۔ ان باتوں کو اگر کہیں بیان کرتے ہیں تو وہ بھی خدا کی شان اور قدرت کے ذکر کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں چاند کی منازل، سورج کی رفتار، آسمانوں اور زمینوں کے طبقات، بارش کے نزول وغیرہ کا جہاں بھی ذکر کیا گیا ہے، وہاں خدا کی قدرت اور عظمت کو ہی بیان کرنے کے لئے کیا ہے۔

ایک دفعہ لوگوں نے حضور اکرم ﷺ سے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کے بارے میں پوچھا۔ تو اس بات کا جواب دینے کے بجائے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قل هي مواقيت للناس والحج 2:189

"آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں کے لئے (عام معاملات میں) اور حج کے لئے اوقات متعین کرنے کا ذریعہ ہے۔)

خلاصہ یہ ہے جو علوم مشاہدات اور تجربات سے حاصل ہو سکتے ہیں وہ براہ راست انبیاء کی

تعلیم کا موضوع نہیں ہوتے۔

(د) انبیاء کی تعلیم کا عام اصول یہ ہے کہ وہ جس قوم کی طرف بھی بھیجے جاتے ہیں اس کے کھانے پینے، لباس، رہائش، عادات اور رسومات یک سر نہیں بدلتے بلکہ پورے معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو بات اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف نظر آتی ہے، اس کو بالکل بدل دیتے ہیں، اور جو اس کے حکم کے مطابق ہوتی ہے، اس کو باقی رکھتے ہیں اور جو کچھ خلاف اور کچھ مطابق ہوں ان میں ترمیم و تبدیلی کر کے حکم کے مطابق بنادیتے ہیں۔

(ح) انبیاء لوگوں کو اللہ کے احکام کی مصلحتیں نہیں سمجھاتے بلکہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور ایسا کرنے سے ناخوش۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مصلحتیں ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتیں، دوسرے لوگوں پر جتنا اس بات کا اثر ہوتا ہے کہ اللہ اس چیز سے خوش ہوتا ہے اور یہ اجر دیتا ہے اور اس چیز سے ناخوش ہوتا ہے اور یہ سزا دیتا ہے، مصلحتیں سمجھانے کا اتنا اثر نہیں ہوتا۔

(و) انبیاء پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، اس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ عقائد، جن کی تعلیم تمام انبیاء یکساں دیتے ہیں، دوسرے وہ احکام جو کہ خاص خاص قوموں اور ملکوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام قوموں کی طرف اور قیامت تک کیلئے مبعوث کئے گئے ہیں، لہٰذا آپؐ کے احکام ان عام اصولوں کے تحت ہیں جو تمام انسانوں کے لئے قیامت تک کے لئے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور جن کی روشنی میں وقت اور جگہ کی ضرورت کے لحاظ سے اجتہاد کر کے ہر پیش آنے والے مسئلے کا حل معلوم کیا جا سکتا ہے۔

آپؐ کی تعلیم کے دو پہلو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کی تعلیم دو طریق پر دیتے تھے۔ ایک اپنے ارشادات کے ذریعے اور دوسرے اپنے عمل کے ذریعے۔ مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ وہ رسولؐ کی پیروی کریں یعنی اس طریق پر عمل کریں جس طرح وہ اپنے رسولؐ کو کرتے دیکھیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفرلكم ذنوبكم 31:2

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔)

ایک جگہ نماز کے طریقے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

صلوا کما رایتمونی ''نماز پڑھو جس طرح تم مجھے دیکھتے ہو''

رسول اللہ کی تعلیم کے مختلف طریقے

آپؐ کی تعلیم مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ عام طور پر آپؐ مجلس میں بیٹھ کر لوگوں سے باتیں کرتے اور اس طرح ان کی تعلیم وتزکیہ ہوتا، کبھی کوئی سائل سوال کرتا تو آپؐ جواب دیتے۔ کبھی مجمع میں تقریر فرماتے، آپؐ کی تقریر چند منٹ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ طویل تقریریں رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ اصحاب صفہ کے نام سے صحابہؓ کی ایک جماعت خصوصیت سے آپؐ کے زیر تعلیم رہتی تھی۔ جب آپ کوئی بات فرماتے تو اس کو تین بار دھراتے تا کہ لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔

حصول علم کی فضیلت وفرضیت

علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا۔ ارشاد نبویؐ ہے: **طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم** ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے''۔

رسول اللہ ﷺ کی بہت سی احادیث سے علم کی فضیلت اور حصول علم پر اجر مرتب ہونا ثابت ہوتا ہے، مثلاً مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

(ا) (ترجمہ) ''جس کو ایسی حالت میں موت آ گئی کہ وہ علم حاصل کر رہا تھا تا کہ اس کے ذریعے اسلام کو زندہ کرے تو اس کے اور نبیوں کے درمیان جنت میں ایک درجہ کا فرق ہوگا''۔

(ب) (ترجمہ) ''اور جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے''۔

(ج) (ترجمہ) ''جو شخص علم کی طلب میں نکلتا ہے تو وہ لوٹنے تک اللہ کے راستے میں ہوتا ہے''۔

اشاعت علم کی تاکید اور فضیلت

رسول اللہ ﷺ نے دینی تعلیمات کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کی تاکید فرمائی۔ ارشاد نبویؐ ہے:

بلغوا عنی ولو آیة ''میری طرف سے پہنچا دو اگرچہ ایک آیت ہو''۔

کسی اچھائی کی تعلیم دینے والے کا درجہ اس اچھائی کے کرنے والے کے برابر قرار دیا گیا:

من دل علیٰ خیر فله مثل اجر فاعله ''جس نے کسی اچھی بات کی طرف راہنمائی کی تو اس کے لئے اس کے کرنے والے جیسا اجر ہوگا''۔

کسی کو علم سکھانا جس سے کہ سیکھنے والا نفع حاصل کرے، ان اعمال میں سے قرار دیا گیا جو انسان کی موت کے بعد بھی جاری رہتے ہیں۔

''جب انسان مرجاتا ہے تو اس سے اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین کے (کہ وہ منقطع نہیں ہوتے) صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے کہ نفع حاصل کیا جائے، نیک بیٹا جو اس کے لئے دعا کرے''۔

مسلسل حصول علم کی ترغیب

قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کو اس دعا کی تلقین کی گئی: رب زدنی علماً ''اے رب میرے علم میں اضافہ فرما''۔ اس ہدایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حصول علم میں تسلسل مطلوب ہے۔ کسی بھی مقام پر قناعت کرنا مطلوب نہیں۔ اس کے علاوہ علم کے کسی مرتبے پر پہنچ کر اس کو آخری حد سمجھ لینا مناسب نہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: وفوق کل ذی علم علیم ''اور ہر علم والے سے بڑھ کر ایک علم والا ہے''۔

فروغ علم کے لئے رسول اللہ کا اہتمام

غزوہ بدر میں قریش کے بعض لوگ قیدی بن کر آئے۔ ان کے متعلقین ان کی رہائی کے لئے مالی فدیہ لے کر آئے۔ اگرچہ اس وقت مسلمانوں کو سخت مالی مشکلات کا سامنا تھا پھر بھی رسول اللہ ﷺ نے مالی فدیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فدیہ کے طور پر ہر قیدی کے ذمے یہ لگایا کہ وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ فروغ علم کے لئے رسول اللہ ﷺ کا یہ ایسا انوکھا اقدام تھا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

حصول علم کے لئے دوسرے اسلامی محرکات

قرآن کریم اور احادیث نبویؐ میں براہ راست ہدایات کے علاوہ حصول علم کے لئے جس میں طبعی (سائنسی) علوم بھی شامل ہیں، اور محرکات بھی ہیں، ان میں سے ایک متحرک مسلمانوں کے لئے یہ ہدایت ہے کہ وہ دنیا میں سیر و سیاحت کر کے ان قوموں کے انجام سے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو جھٹلایا تھا، عبرت حاصل کریں۔ ایک محرک مسلمانوں کے لئے یہ حکم ہے کہ اپنے دشمنوں اور اللہ کے دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لئے جتنی زیادہ قوت اور سامان جنگ تیار کر

سکیں کریں۔ یہ حکم جنگی صنعتوں اور ان سے متعلقہ سائنسی علوم کے حصول کے لئے ایک اہم محرک ہے۔

آیات قرآنی میں کائنات میں مظاہر قدرت کے بار بار حوالے مثلاً چاند کی مختلف منزلوں کا ذکر، ہر چیز کو ایک خاص نسبت سے پیدا کرنے کا بیان، سورج اور چاند کے خاص خاص دائروں میں حرکت کرنے کا ذکر، ہر چیز کے جوڑا جوڑا پیدا کرنے کا بیان۔ یہ سب چیزیں سائنسی تحقیقات کے لئے محرکات کا کام دیتی ہیں۔ نماز، روزہ، حج، اور جہاد وغیرہ کے احکام بھی سائنسی مطالعے کے محرکات کا کام دیتے ہیں۔ نماز کے اوقات معلوم کرنے اور نماز کے لئے سمت قبلہ کے تعین کے لئے مسلمانوں کو سورج اور ستاروں کا ارتفاع اور ان تمام مقامات کے جہاں پر کہ مسلمان آباد ہوں، طول بلد، عرض بلد معلوم کرنے پڑتے ہیں۔

خبر، خراج، عشر اور غنیمت کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی ہدایات بھی ایک علمی محرک ثابت ہوئیں ان مدوں سے جو آمدنی ہوتی تھی اس کے حساب کتاب کے لئے ریاضی کا علم حاصل کرنا ضروری تھا۔

ورثے کی تقسیم بھی، جس کے متعلق قرآن کریم نے واضح احکام دیئے ہیں، علم الحساب کے لئے ایک محرک ثابت ہوئی اسلام کے قانون وراثت کے مطابق ورثاء میں ان کے حصوں کی تقسیم کے لئے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ طبی معاملات کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات مثلاً یہ کہ ہر اس بیماری کے لئے جس میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو مبتلا کرتا ہے، اس نے ایک مناسب علاج پیدا کیا ہے، مسلمانوں کی طبی تحقیقات کا ایک ذریعہ ثابت ہوئے۔ انسانوں کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کے لئے اسلامی ہدایات نے مسلمان حکمرانوں اور عام لوگوں کی توجہ ادویات کی تیاری، حفظان صحت کی ترقی اور نئے ہسپتالوں کے قیام کی طرف مبذول کرائی۔

علماء کا مقام

حدیث نبویؐ میں علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جب اللہ کسی کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو دین کی فہم عطا فرما دیتا ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات بھی علماء کے بلند مقام پر روشنی ڈالتی ہیں۔

(۱) ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً

"جس کو حکمت دی گئی اس کو خیر کثیر دی گئی"۔

(ب) انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء
''اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ہی پر خشیت طاری ہوتی ہے''۔
قرآن کریم نے اہل علم کو علم نہ رکھنے والوں کے مساوی قرار نہیں دیا۔ اس سے علما کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔
قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون
''آپ کہہ دیجئے کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے برابر ہیں''۔
علماء کو عبادت گزار لوگوں پر بھی فضیلت دی گئی ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے:
فضل العالم علی العابد، کفضلی علیٰ ادناکم
''عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے سب سے ادنیٰ پر''۔
رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے نتیجے میں نئے نئے علوم کی بنیاد پڑی۔ مثلاً فقہ اور اصول فقہ، عربی زبان کی گرامر وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد نے
من کزب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار
''جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے''۔
مسلمانوں کو محتاط کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے لئے علم الرجال وجود میں آیا تاکہ کسی روایت پر یقین کرنے سے پہلے راوی کو یا کسی خبر کو ماننے سے پہلے مخبر کو پرکھ لیا جائے۔ اس اصول نقد و تحقیق سے بے سروپا داستانوں کا اصل تاریخی واقعات سے جدا کرنا آسان ہو گیا اور اس طرح علم تاریخ کو ایک ٹھوس اور مستند شکل حاصل ہو گئی۔

اس طرح مشاہدہ کائنات کے بارے میں قرآن کریم کی ہدایات نے مسلمانوں کو مشاہدات (یا تجربات جو دراصل مشاہدات ہی ہیں، جو مخصوص حالات میں کئے جاتے ہیں) کی طرف متوجہ کیا اور آگے چل کر مشاہدات و تجربات ہی سائنسی تحقیقات کی بنیاد قرار پائے۔ ان مشاہدات و تجربات کے لئے سائنسی اسلوب (Scientific Methods) ایجاد ہوئے۔ یہ وہ انقلابی اقدام ہے جس کی بدولت صحیح معنی میں سائنسی علوم وجود میں آیا۔
رسول اللہ ﷺ کی ہدایات و تعلیمات کی بدولت مسلمانوں میں ایک وسیع علمی تحریک پیدا ہو گئی، جس کا تفصیل سے ذکر مسلم مورخین نے کیا ہے اور غیر مسلم محققین بھی اس کا اعتراف کرتے

بھی نہ ہو سکے۔ انگلستان کے ایک محقق رابرٹ بریفالٹ لکھتے ہیں کہ اس امر کی نہ کوئی مثال پہلے موجود تھی اور نہ اب تک ہے کہ کسی وسیع سلطنت کے طول و عرض میں حکمران طبقے اتنے بڑے پیمانے پر حصول علم کی مجنونانہ خواہش سے سرشار ہو گئے ہوں۔ خلفاء، امراء اپنے محلوں سے اٹھ کر کتب خانوں اور رصدگاہوں میں جا گھستے تھے۔ اہل علم کے خطبات کو سنتے اور ان سے مسائل ریاضی کے متعلق مذاکرات کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے۔ مسودات و مخطوطات اور نباتاتی نمونوں سے لدے ہوئے کاروان بخارا سے دجلہ تک رواں دواں رہتے۔ کتابوں اور معلموں کے حصول کی خاطر قسطنطنیہ اور ہندوستان کو خاص سفیر بھیجے جاتے تھے۔ کسی سلطنت سے تاوان جنگ وصول کرنے کے سلسلے میں یونانی مصنفین یا کسی ممتاز ریاضی کی تصنیف حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملحق ہوتا تھا۔ وزرائے سلطنت کتب خانوں کے قیام، مدارس کے لئے اوقاف کے انتظام اور غریب طلبہ کے لئے وظائف کے اہتمام میں اپنے آقاؤں سے بھی آگے بڑھ جانا چاہتے تھے۔ اہل علم کو بلا امتیاز نسل و مذہب دوسرے سب لوگوں پر فوقیت دی جاتی تھی۔ ان پر دولت و ثروت اور اعزازات کی بارش کر دی جاتی تھی۔ وہ ولایات کے حاکم تک مقرر کر دیئے جاتے۔ جب خلفاء کسی سفر یا مہم پر روانہ ہوتے تو اہل علم کا ایک گروہ اور کتابوں سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطار ہمراہ ہوتی تھی۔

یہ علمی تحریک بارہویں صدی میں زیادہ تر مسلم اسپین کے ذریعے یورپ میں جہاں کہ لکھنا پڑھنا خانقاہوں تک محدود تھا اور جہاں تعلیم کے بارے میں گریگوری پادری جیسے شخص کا یہ خیال تھا کہ جہالت پارسائی کی بنیاد ہے، پھیلنا شروع ہوئی اور یہی علمی تحریک سولہویں صدی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کا سبب بنی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مشرق و مغرب میں علم کی روشنی پھیلنے میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا کتنا عظیم حصہ ہے۔

افسوس کہ علم کی روشنی کو دنیا تک پہنچانے والی مسلمان قوم آج عام طور پر علم سے محروم ہے اور اپنے دین اور تاریخ اور دوسرے علوم سے ناواقفیت کی وجہ سے دنیا کی بہت سی قوموں کے مقابلے میں پس ماندہ ہے۔

ضرورت ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں آج مسلمان پھر سے علم ہدایت کی شمع روشن کریں اور دنیا کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں۔

نبوت کا عطیہ

مولانا سید ابوالحسن ندوی

دنیا کی تاریخ میں کثرت سے ایسے افراد اور جماعتیں گزریں ہیں جنھوں نے انسانیت کی خدمت کی ہے اور دنیا کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا ہے۔ اس موقع پر وہ سب تاریخ کی سطح سے ابھر آتے ہیں اور اپنے کو انسانیت کا معمار و خدمت گزار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور امیدوار ہوتے ہیں کہ ان کو بھی اس معیار سے جانچا اور پرکھا جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے ان کو بھی موقع دینا چاہیے اور ان کی خدمات و احسانات کا موازنہ کرنا چاہیے پھر فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

سب سے پہلے ہمارے سامنے ایک سنجیدہ اور باوقار گروہ آتا ہے، یہ حکماء فلاسفہ کی جماعت ہے۔ ان میں یونان کی بڑے بڑے فلسفی بھی ہیں اور ہندوستان کے بلند پایہ حکیم بھی۔ ہمارا ذہن حکمت و فلسفہ سے شروع سے مرعوب رہا ہے۔ ہم ان کو دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں کہ انہوں نے انسانیت کا سر اونچا کیا ہے اور اس کا دامن حکمت کے موتیوں سے بھر دیا ہے لیکن تعصبات اور عقیدت مندی سے ذرا آزاد ہو کر غور کیجئے کہ کیا ان کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور کیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ انسانیت کے حق میں رحمت ثابت ہوئے ہیں؟ میں پوچھتا ہوں کہ انسانیت نے ان سے کیا پایا، اس کی کونسی پیاس بجھی، انہوں نے اس کے کس درد کا مداوا کیا؟ غور کرنے پر ہم کو مایوسی ہوتی ہے! ذرا آپ فلسفہ کا مطالعہ کیجئے اور فلاسفہ کی زندگی پر نظر ڈالئے۔ صاف معلوم ہوگا کہ فلسفہ زندگی کے سمندر میں ایک مختصر سا جزیرہ تھا، ایک محفوظ جگہ تھی، ایک محدود دائرہ تھا۔ یہ حکماء و فلاسفہ اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں، خدا کی دی ہوئی طاقتیں اس محدود دائرے کے اندر صرف کر رہے تھے۔ انسانیت کے وہ مسائل جن کو ذرا دیر کے لئے بھی ٹالا نہیں جا سکتا اور جو فوری حل کے محتاج ہیں، جن کے بغیر انسانیت کی گاڑی ایک قدم بھی نہیں چل سکتی، ان حکماء نے نہ ان مسائل کو چھیڑا نہ ان سے بحث کی اور نہ ان مسائل میں انسانیت کی کوئی مدد کی، وہ اپنے اس علمی جزیرے کے اندر عافیت کی زندگی گزارتے رہے۔ لیکن انسانیت تو ان چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بند نہیں تھی۔ یونان جہاں فلاسفہ بہت گزرے ہیں، اس یونان میں بھی سارے کے سارے فلسفی ہی تو نہیں تھے۔ ان فلسفیوں نے کواکب و سیارات سے تو بحث کی اور فلکیات پر موشگافیاں کیں، مگر زندگی کے لئے کیا ہدایات دیں اور علمی طبقہ کو چھوڑ کر دوسرے طبقات کی کیا رہنمائی کی؟ انہوں نے بھٹکتی

ہوئی انسانیت اور سسکتی ہوئی زندگی کے لئے کیا کیا؟ وہ زندگی میں رہتے ہوئے بھی زندگی سے بے تعلق تھے۔ انہوں نے اپنے گرد علم وحکمت کا ایک حصار کھینچ لیا تھا اور صرف چند علمی مسائل سے تعلق رکھا تھا۔

یہ ایک سیاسی دور ہے اور ہمارا ملک اب آزاد ہے۔ شاید آپ اس مثال سے فلاسفہ کی صحیح پوزیشن سمجھ سکیں۔ دیکھئے آپ کے ملک میں مختلف بیرونی ممالک کے سفارت خانے ہیں۔ کوئی امریکی سفارت خانہ ہے، کوئی روسی سفارت خانہ ہے، کوئی مصر کا ہے، کوئی ایران کا۔ ان سفارت خانوں کے اندر بھی زندگی اور حرکت ہے، ان کے اندر بھی بہت سے لوگ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں، بڑے بڑے فاضل اور سیاسی مبصر بھی ہیں لیکن ان کو ہمارے ملک کے اندرونی مسائلسے کوئی دلچسپی نہیں، ہمارے آپس کے تعلقات اور باہمی کشاکش سے کوئی واسطہ نہیں، یہاں کی غریبی امیری، اخلاقی ترقی وانحطاط سے ان کو بحث نہیں، ان کا ایک محدود مخصوص کام ہے اور وہ صرف وہی کام انجام دیتے ہیں، اس لئے وہ یہاں ہوکر بھی ایسے ہیں گویا وہ یہاں نہیں ہیں۔ بس اسی طرح حکمت وفلسفہ ایک غیر ملکی سفارت خانہ کی طرح قائم تھا اور یہ حکماء وفلاسفہ ان سفارت خانوں کی چاردیواری کے اندر علم وحکمت کی نمائندگی کررہے تھے اور زندگی کے مسائل سے بے تعلق تھے۔

دوسری جماعت جو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ ادباء وشعراء کی جماعت ہے۔ ہم کو اور آپ کو ادب وشاعری کا ذوق ہے اور ہم ادب وشعر کی تحقیر نہیں کرتے، لیکن بے ادبی معاف! کہ ادباء وشعراء نے بھی انسانیت کے دکھ کا علاج نہیں کیا انہوں نے ہمارے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچایا، ہمارے ادب وزبان کو مالا مال کیا۔ لیکن انسانیت کی اصلاح کا دردسر مول نہیں لیا اور نہ یہ ان کے بس کی بات تھی، زندگی بنتی اور بگڑتی رہی، انسانیت گرتی اور سنبھلتی رہی اور یہ اپنے میٹھے بول سناتے رہے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ لوگ اپنی اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہوئے، کہیں لڑائی جھگڑا ہورہا ہو، کہیں زندگی کے مسائل درپیش ہوں اور کوئی بانسری بجانے والا بڑی سریلی آواز میں بانسری بجاتا گزر جائے۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے اس کا لطف لے سکتے ہیں۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہوسکتے ہیں، مگر اس ترنم سے آپ زندگی کے مسائل تو حل نہیں کرسکتے اور نہ اس سے کوئی پیغام حاصل کرسکتے ہیں۔ شعر وادب ہماری زندگی کے لئے کتنا ہی ضروری سہی اور اس سے ہماری روح کی بالیدگی اور اس سے ہمارے دماغ کو کیسی ہی تازگی حاصل ہو، لیکن یہ ہمارے مسائل کا حل اور ہمارے درد کی دوا تو نہیں۔ پھر ان ادباء وشعراء کو کسی چیز پر اصرار بھی نہیں

تھا۔ وہ کسی مقصد کے لئے جدو جہد بھی نہیں کر تے تھے اور نہ اس کے لئے قربانیاں کرنا ان کے بس کی بات تھی اور اصلاح وانقلاب اس کے بغیر ہوا نہیں کرتا۔

تیسرا گروہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ فاتحین کا ہے جنہوں نے ملکوں کو فتح کیا اور اپنے زور شمشیر سے قوموں کو تسخیر کیا اس گروہ سے بھی ہم اچھے خاصے مرعوب ہیں۔ ان کی تلواروں کی جھنکار ابھی تک ہمارے کانوں میں آرہی ہے۔ بظاہر ان کے شور سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انسانیت کی بڑی خدمت کی مگر ان کے نام کے ساتھ کون سی تاریخ وابستہ ہے؟ کیا عدل وانصاف کی یادرندگی وسفاکی کی؟ سکندر کا نام آتا ہے تو اس کے مظالم کی داستان تازہ ہو جاتی ہے، کیا وہ انسانیت کا محسن تھا، اس نے یونان سے ہندوستان تک تمام ملکوں کو زیروزبر کردیا۔ ملک کے ملک اس کی وجہ سے امن وامان اور زندگی کے لطف سے محروم ہوگئے۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی سینکڑوں برس تک یہ ملک سنبھل نہ سکے۔ یہی حال سیزر، چنگیز خاں اور دوسرے بڑے بڑے فاتحین کا ہے، فاتح چاہے اپنے ملک کا محسن ہو یا اپنی قوم کے لئے رحمت ہو مگر دوسری قوموں کے لئے عذاب اور مصیبت ہے۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا آتا ہے جو ملک کے آزاد کرانے والے ہیں اور قومی لیڈر ہیں۔ اس گروہ کا جب نام آتا ہے تو احترام سے گردنیں جھک جاتی ہیں۔ حقیقتاً انہوں نے اپنے ملک کے لئے بڑا کام کیا مگر اس ملک کے باہر بسنے والے انسانوں کے لئے کیا کیا آپ ابراہیم لنکن کے نام سے واقف ہونگے وہ جدید امریکہ کا معمار ہے، مگر بتایئے کہ ہندوستان، مصر وعراق اور ان جیسے اور ملکوں کو اس سے کیا فائدہ پہنچا؟ نتائج پر نظر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس نے ایک امپیریلسٹ طاقت پیدا کردی اور دنیا کی غلامی کی زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ کردیا۔ سعد زاغلول کون تھا؟ مصر کا محسن اور وہاں کی تحریک آزادی کا سب سے مشہور رہنما، مگر مصر سے باہر اس نے کیا کیا اور اس کا ہم پر کیا احسان ہے؟ یہ قوم پرستی تو دراصل دوسرے ملکوں اور قوموں کے لئے مصیبت ہے اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی اپنی قوم کی برتری اور دوسری قوموں کی تحقیر پر ہے اور اکثر اس کو اپنی قوم کا پایہ بلند کرنے کے لئے دوسری قوموں کو غلام بنانا پڑتا ہے۔

پانچواں گروہ وہ ہے جو سائنٹسٹ کہلاتا ہے جس نے نئی نئی ایجادیں کیں اور بہت سی کارآمد چیزیں بنائیں۔ بلاشبہ اس گروہ نے انسانوں کی بڑی خدمت کی۔ یہ تمام ایجادیں جو ہمارے کام آتی ہیں جیسے بجلی، ہوائی جہاز، ریل اور ریڈیو، انہیں سائنٹسٹ حضرات کی مرہون منت ہیں۔ اس

کے لئے انہوں نے بڑی محنتیں کیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ انسانوں کے بڑے کام آ رہی ہیں۔ مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایجادیں تنہا کافی نہیں، ان ایجادوں کے ساتھ اگر نیک ارادے نہ ہوں، صبر وضبط نہ ہو، خدمت خلق کا جذبہ نہ ہو، اس سے اگر انسانیت کے ضروری مسائل حل نہ ہوں تو بتائیے کہ یہ ایجادیں انسان کے لئے رحمت ہیں یا زحمت؟ انہوں نے یہ ایجادیں تو انسان کو دے دیں مگر ان کے استعمال کا صحیح جذبہ نہیں دیا۔ وہ ذہن وضمیر نہیں پیدا کیا جو ان سے فائدہ اٹھائے اور ان کو ٹھکانے لگائے اور ان سے غلط کام لینے سے پرہیز کرے۔ گزشتہ دو جنگوں کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور خدا ترسی کے بغیر یہ ایجادیں اور یہ وسائل انسانیت کے حق میں قہر وعذاب ہیں، رحمت وراحت نہیں۔ میں ان سائنس دانوں کی تحقیر نہیں کرتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ایجاد کا کارنامہ نیک مقاصد، اخلاقی طاقت اور دماغی توازن کے بغیر مکمل نہیں ادھورا ہے۔ جب تک انسان کے دل میں نیک خواہش نہ ہو اور خود اس کے اندر نیک کام کرنے کی تحریک اور تقاضہ نہ پیدا ہو اس کو وسائل وآلات، مواقع وامکانات اور سہولتیں اور آسانیاں نیک نہیں بنا سکتیں، فرض کیجئے میرے پاس دینے کو روپیہ بھی ہے لینے کو بہت سے محتاج بھی ہیں، میرا کوئی ہاتھ نہیں پکڑتا، مگر میرے اندر فیاضی کا جذبہ اور مدد کرنے کی خواہش نہیں تو مجھے کون دینے پر آمادہ کرسکتا ہے؟

اب ایک دوسرا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ پیغمبروں کا گروہ ہے، یہ گروہ ایجادات و اکتشافات کا دعویٰ نہیں کرتا نہ وہ علوم میں مہارت کا مدعی ہے۔ نہ اس کو ادب وشاعری پر ناز ہے۔ وہ اپنے متعلق نہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے، نہ بے ضرورت خاکساری سے، وہ بڑی صفائی اور سادگی سے کہتے ہیں کہ دنیا کو دو تین چیزیں عطا کرتے ہیں:

١۔ صحیح علم

٢۔ اس علم پر یقین

٣۔ اس علم پر عمل کرنے اور اس یقین کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ اور خواہش

یہ ہے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک کی تعلیم کا نچوڑ۔

اب میں بتاتا ہوں کہ وہ صحیح علم کیا ہے جو پیغمبر انسانوں کو دیتے ہیں، وہ علم اس کا کہ دنیا کو کس نے بنایا؟ پیغمبر کہتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کو کس نے پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا؟ اس کے معلوم کئے بغیر ہمارا ہر قدم غلط ہے، ہم کو اس دنیا کی کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کا کوئی

حق نہیں۔ اس لئے کہ اس زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے، چلنا پھرنا، کھانا پینا وہ سب اس عظیم کل کا ایک حقیر جز ہے۔ جب تک کہ ہم کو اس کائنات کا مرکز معلوم نہیں اور ہم اس کے قصد کلی سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ہم کو اس کے اجزاء سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ اس کے بغیر تو روٹی کا ایک ٹکڑا توڑنا حرام ہے، ہم بھی اس کائنات کا ایک حقیر جز ہیں اور غلہ کا جو دانہ ہم استعمال کرتے ہیں وہ بھی اس مجموعہ کی ایک بہت حقیر کسر اور ایک ادنیٰ ذرہ ہے۔ بلکہ ہم جس سیارہ (زمین) پر بس رہے ہیں وہ بھی اس کائنات کا حقیر ذرہ ہے۔ ہماری اس زمین کی اس نظام فلکی میں کیا حیثیت ہے؟ اگر آپ کو وہ نسبت معلوم ہو جائے جو آپ کی سرزمین اور سورج کے درمیان ہے یا دوسرے سیاروں اور ثوابت سے ہے تو آپ کو اپنے وجود سے بھی شرم آنے لگے گی اور اپنے عظیم الشان وطن سے بھی۔ آپ کے اور اس کائنات کے دوسرے اجزاء کے درمیان کس نے ربط پیدا کیا؟ اسی خالق کائنات نے اور اسی مقصد کلی نے! اگر آپ اس خالق کائنات کو نہیں جانتے یا نہیں مانتے اور اس مقصد کلی سے آپ کو اتفاق نہیں ہے تو آپ کو اس کائنات کے کسی ذرے یا دوسرے جز سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اگر روٹی کا وہ ٹکڑا جو آپ کے ہاتھ میں ہے آپ سے سوال کرے کہ میں نے تو اپنے خالق کو پہچان لیا اور اس کے حکم کے مطابق میں نے اپنے مخدوم (انسان) کے لئے اپنے وجود کو قربان کر دیا لیکن اے انسان! تو نے نہ اپنے خالق کو جانا نہ اس کی بندگی کی، تجھے مجھ سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ اسی طرح اس دنیا کی کسی چیز کا استعمال غلط ہے جب تک یہ جان نہ لیا جائے کہ اس کا پیدا کرنے والا کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے! مگر یہ عجیب ٹریجڈی ہے کہ آج دنیا میں تمام کام ہو رہے ہیں، بازار میں چہل پہل ہے، تعلقات قائم ہو رہے ہیں، سواریاں چل رہی ہیں، بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں مگر کسی کو یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں کہ جس دنیا میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اس کا پیدا کرنے والا کون ہے، اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ جب پیغمبر دنیا میں تشریف لائے انسانیت کی گاڑی بے مقصد جا رہی تھی۔ فلاسفر، علماء، شعراء، فاتحین، حکمرانوں، کاشتکاروں اور تاجروں کو اپنے کاموں سے فرصت نہ تھی، حاکم بھی تھے اور محکوم بھی تھے، ظالم بھی تھے اور مظلوم بھی تھے۔ مگر سب اصل مقصد سے غافل اور اپنے پیدا کرنے والے سے ناواقف، ان چھوٹے چھوٹے بالشتیوں جیسے انسانوں میں ایک بلند قامت انسان آتا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں انسانیت کی باگ ڈور تھی، ان سے سوال کرتا ہے کہ جواب دو کہ تم نے انسانوں پر یہ کیا ظلم کیا ہے کہ ان کو اپنے مالک

اوراس دنیا کے بادشاہ سے ہٹا کر اپنا غلام بنالیا؟ تم کو کیا حق تھا کہ نابالغ انسانیت کا ہاتھ پکڑ کر
نے اس کو غلط راستہ پر ڈال دیا ہے؟ اے ظالم ڈرائیور! تو نے مسافروں سے پوچھے بغیر زندگی کی
گاڑی کس طرف چلانی شروع کر دی؟ وہ زندگی کے قلب وضمیر میں کھڑے ہوکر انسانیت سے
خطاب کرتا ہے۔ اوراس کو پکارتا ہے اس کے سوال کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اس کی دعوت اور پکار پر
گروہ ہو جاتے ہیں:

۱۔ ایک اس کی بات مانتا ہے

۲۔ ایک انکار کرتا ہے

دنیا کو ان دونوں راستوں میں ایک راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ پیغمبر کبھی نہیں کہتے کہ ہم قدرت کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرنے آئے ہیں۔ ہم طبعی طاقتوں کو مسخر کرنے آئے ہیں، ہم کچھ نئی ایجادیں کریں گے، وہ جغرافیہ ومعدنیات میں مہارت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا کے بنانے والے اور اس کی ذات وصفات کا صحیح علم عطا کرتے ہیں جو ہم کو اس دنیا کے مالک نے اور انسان کے خالق نے عطا کیا ہے اور اب ہمارے ہی ذریعہ سے وہ دوسروں کو مل سکتا ہے۔

وہ بتاتے ہیں کہ اس دنیا کا بنانے والا ایک ہے اور اسی کی مرضی وحکمت سے یہ دنیا چل رہی ہے، بلاشرکت غیرے اس کو چلا رہا ہے یہ دنیا بے مقصد نہیں پیدا کی گئی اور نہ بے مقصد چل رہی ہے۔ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہوگی جس میں اس پہلی زندگی کا حساب دینا ہوگا۔ وہاں اچھے اعمال کا انعام ملے گا، برے اعمال کی سزا ملے گی، قانون لانے والے اور خدا کا منشاء بتلانے والے پیغمبر ہیں جو ہر ملک اور ہر قوم میں آئے اور خدا کا پیغام لائے، خدا کا راستہ ان کے بغیر طے نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر تمام پیغمبر متفق ہیں ان میں کسی کا اختلاف نہیں، فلاسفہ وحکماء میں سخت اختلاف ہے ان میں سے دو بھی کسی ایک بات پر متفق نہیں۔ لیکن یہاں کسی ایک بات پر بھی دو پیغمبروں میں اختلاف نہیں۔

لیکن تنہا علم کے لئے یقین ضروری نہیں، آج ہماری معلومات کتنی زیادہ ہیں مگر ہمارا یقین کتنا کم ہے، علم ہمیشہ یقین پیدا نہیں کرتا، قدیم زمانہ کے فلاسفہ میں سے بہت سے یقین سے محروم تھے اور شک کے مریض۔ آج بھی ان کا علم یقین پیدا کرنے کے بجائے الٹا شک پیدا کرتا ہے۔ آج بھی بڑے بڑے صاحب علم یقین کو ترستے ہیں۔ انبیاء علیہ السلام تنہا صحیح علم نہیں دیتے

یقین بھی عطا کرتے تھے۔ علم بڑی دولت ہے مگر اس پر یقین اس سے بڑی دولت ہے۔ علم اس پر یقین کی زبان کی ورزش ہے، دماغ کا تعیش اور دل کا نفاق۔ پیغمبروں نے اپنے ماننے والوں کو صحیح علم عطا کیا اور مضبوط یقین، انہوں نے جو کچھ جانا اس کو مانا، پھر اپنے کو اس پر قربان کر دیا۔ ان کے دماغ اس علم سے روشن ہوئے اور ان کے دل اس یقین سے طاقتور۔ ان کے یقین کے قصے تاریخ میں پڑھیے ان کے یقین کے نتائج اپنی گرد و پیش کی دنیا میں دیکھیے۔

آج اگر یقین ہوتا تو بد اخلاقی کیوں ہوتی؟ ظلم کیوں پھیلتا؟ رشوت کا بازار کیوں گرم ہوتا؟ کیا یہ تمام خرابیاں اس لئے ہیں کہ علم نہیں۔ لوگوں کو معلوم نہیں کہ چوری جرم ہے، رشوت حرام ہے، گرہ کٹی بد اخلاقی ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ جہاں علم زیادہ ہے وہاں خرابیاں بھی زیادہ ہیں، جو لوگ رشوت کی برائی پر کتاب لکھ سکتے ہیں اور اس کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں وہ زیادہ رشوت لیتے ہیں، جو چوری کی خرابی سے اور اس کے انجام سے زیادہ واقف ہیں، وہ چوری زیادہ کرتے ہیں۔ گرہ کٹوں کو دیکھئے ان میں سے بہت سے ایسے ملیں گے جو گرہ کٹی کے الزام میں کئی کئی بار سزا بھگتے ہوئے ہوتے ہیں، کیا ان سے زیادہ کوئی گرہ کٹی کے انجام اور سزا سے واقف ہوگا۔ اگر صرف علم کافی ہوتا تو چوری کی سزا کے بعد چوری چھٹ جاتی اور ایک بار جرم کرنے اور سزا بھگتنے کے بعد کوئی جرم نہ کرتا۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا علم تنہا کافی نہیں۔

پھر علم ضروری اور یقین ضروری۔ مگر اس کی کیا ضمانت کہ اس پر عمل کا تقاضا بھی پیدا ہوگا۔ بہت سے لوگ جانتے بھی ہیں اور یقین بھی رکھتے ہیں کہ شراب بری چیز ہے، اس کے نقصانات کا تجربہ بھی ہے، یقین بھی، مگر پیتے ہیں۔ آپ کے شہر میں بہت سے ڈاکٹر حکیم ہونگے جو بد پرہیزی کرتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ بد پرہیزی خطرناک ہے مگر وہ بد پرہیزی کر گزرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عمل کا تقاضا نہیں ہوتا اور ان کے اندر پرہیز کی خواہش اور بد پرہیزی سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ بد پرہیزی کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اس خواہش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

انبیاء کرام علم و یقین کے ساتھ یہ تیسری طاقت بھی عطا کرتے ہیں، یعنی اپنے علم و یقین پر عمل کرنے کی رغبت اور اپنی غلط خواہشات کا مقابلہ کرنے کی طاقت۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علم و یقین سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ ان کا ضمیر ان کی نگرانی کرتا ہے اور غلط کام کرنے کے وقت ان کا ہاتھ پکڑ تا لیتا ہے۔

ہر پیغمبر نے یہ تینوں دولتیں اپنے اپنے زمانہ والوں اور اپنی اپنی امتوں کو عطا کیں اور ان کی

بدولت لاکھوں انسانوں کی زندگی بن گئی اور زندگی کی چول اپنی جگہ پر آ گئی۔ انسانیت پر یہ احسان انہیں پیغمبروں کا ہے، اللہ کا درود وسلام ہو ان پر کہ انہوں نے انسانیت کی کشتی کو عین وقت پر ہلاکت سے بچا لیا۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ دولتیں دنیا سے ناپید ہونے لگیں۔ علم صحیح گم ہو گیا، یقین کا چراغ بجھ گیا، عمل کی خواہش مردہ ہو گئی۔ چھٹی صدی مسیحی آئی تو یہ تینوں دولتیں اتنی نایاب ہو چکی تھیں کہ ان کا سراغ لگانا مشکل تھا، پورے پورے ملک اور پورے پورے براعظم میں بھی ڈھونڈے سے ایک اللہ کا بندہ نہ ملتا جو علم صحیح اور ایمان قوی کی دولت سے مالا مال ہو، انبیاء کا لایا ہوا دین اور پھیلایا ہوا یقین سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ بن گیا تھا۔ شک و بے عملی کی ظلمتوں میں علم و یقین کا یہ نور اس طرح کہیں کہیں چمکتا تھا جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں، اہل یقین کا ایسا قحط تھا کہ ایران کا ایک نوجوان سلمان فارسی یقین اور حسن عمل کی تلاش میں نکلتا ہے تو ایران سے شام اور وہاں سے حجاز پہنچ جاتا ہے اور ان تین ملکوں میں اس کو صرف چار صاحب یقین ملتے ہیں۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے اور اس عالمگیر ظلمت میں خدا کا آخری پیغمبر آتا ہے وہ ان تینوں دولتوں کو اتنا عام کر دیتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنی عام نہیں ہوئی تھیں۔ جو دولت کسی کسی سینہ اور کسی کسی سفینہ میں تھی جو گھروں سے نکل کر محلوں میں بھی اور محلوں سے نکل کر شہروں میں بھی نہیں پھیلی تھی وہ گھر گھر عام ہو جاتی ہے اور مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل جاتی ہے:

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

وہ ان تینوں حقیقتوں کی تلقین ہی نہیں کرتا، ان کا صور پھونک دیتا ہے، دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی کان والا ایسا نہیں جو کہہ سکے کہ اس نے اس صور کی آواز نہیں سنی اور جس نے نہیں سنی اس کے کان کا قصور ہے، اس کے اعلان کا قصور نہیں۔ آج دنیا کا کون سا گوشہ ہے جہاں **اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد رسول الله** کا ترانہ سننے میں نہیں آتا۔ جب دنیا کی تمام آوازیں تھک کر سو جاتی ہیں، جب جیتے جاگتے شہروں پر موت کی سی نیند طاری ہو جاتی ہے، جب زبانوں پر قفل پڑ جاتے ہیں اس وقت بھی کانوں میں یہ صدا آتی ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

آج ریڈیو کے ذریعہ دنیا کے کونہ کونہ میں آواز پہنچتی ہے اور گھر گھر پیغام پہنچ جاتا ہے۔ لیکن

کیا کسی ریڈیو نے خواہ وہ امریکہ کا ہو یا برطانیہ کا، کسی حقیقت کو کسی علم کو اس طرح دنیا میں عام کیا ہے جس طرح یہ علم عام ہوا ہے جس کی صدا نبی امی نے کوہ صفا کی چوٹی پر چڑھ کر لگائی تھی! انسان کبھی ترنگ میں آتا ہے اور طفلانہ معصومیت کے ساتھ کچھ کہنے لگتا ہے۔ ایسی ہی ترنگ میں اقبال نے انسانوں کی طرف سے اپنے مالک کی بارگاہ میں عرض کیا:

ترا اخراج فرشتے نہ کر سکے آباد

اگر آج محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک ادنیٰ غلام عرض کرے تو کیا بے جا ہے کہ خدایا تیری خدائی برحق تو محمد رسول اللہ ﷺ کا خالق اور اس ساری دنیا کا خالق و مالک اور ہر شے پر قادر ہے لیکن کیا تیرے بندوں اور تیری مخلوقات میں سے کسی نے تیرا نام اس طرح پھیلایا اور دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا جس طرح تیرے بندے اور پیغمبر محمد رسول ﷺ نے؟ یہ کوئی بے ادبی اور سرکشی نہیں۔ اس میں بھی تعریف اسی خدا کی ہے جس نے محمد رسول اللہ ﷺ جیسا پیغمبر بھیجا اور ان کو اپنا نام پھیلانے اور اپنا دین چمکانے کی یہ طاقت اور توفیق عطا فرمائی۔

آنحضرت ﷺ نے بدر کے میدان میں جب اپنی چودہ پندرہ سال کی کمائی اللہ کے دین کی بقا کے لئے سامنے رکھ دی اور 313 کو ایک ہزار کے مقابلہ میں لاکر کھڑا کر دیا تو زمین پر سر رکھ کر اپنے مالک سے یہی کہا تھا کہ "اے اللہ! اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کو آج ہلاک کر دینے کا فیصلہ فرماتا ہے تو قیامت تک تیری عبادت نہ ہو سکے گی"۔

آنحضرت ﷺ نے توحید کی جو صدا لگائی تھی اس سے دنیا کا کوئی مذہب، کوئی فلسفہ اور کوئی دماغ غیر متاثر نہیں رہا۔ جب سے دنیا نے سنا کہ انسان کے لئے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنا ذلت اور عار ہے۔ خدا نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے سامنے اس لئے جھکایا تاکہ سب سجدے اس کی اولاد پر حرام ہو جائیں، وہ سمجھ لے کہ جب اس کارخانہ قدرت کے کارندے ہمارے سامنے جھکا دیے گئے تو ہم کو اس دنیا کی کسی چیز کے سامنے جھکنا کب زیب دیتا ہے۔ جب سے دنیا نے توحید کی حقیقت اور انسان نے اپنی یہ حیثیت سنی اس وقت سے شرک خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا۔ اس کو احساس کمتری نے گھیر لیا۔ آپ کو بعثت محمدی کے بعد اس کے لب و لہجہ میں فرق محسوس ہوگا۔ اب وہ اپنے عمل پر نازاں نہیں، وہ اس کی تاویل اور فلسفیانہ تعبیر کرتا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ توحید کی آواز نے دل میں گھر کر لیا ہے۔

پھر محمد ﷺ نے اس علم و یقین کے ساتھ وہ طاقت بھی پیدا کر کے دکھا دی جس میں ہزار

پولیس سینکڑوں عدالتوں اور بیسیوں حکومتوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ یعنی ضمیر کی طاقت، نیکی کی رغبت، گناہ سے نفرت اور نفس کا خود احتساب۔

یہ اسی طاقت کا کرشمہ تھا کہ ایک صحابیؓ جن سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو جاتا ہے وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ ضمیر چٹکیاں لینے لگتا ہے اور وہ حضور ﷺ کی خدمت میں آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں: حضورؐ! مجھ کو پاک کر دیجئے، آپ رخ انور پھیر لیتے ہیں وہ اسی طرف آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ دوسری طرف رخ کر لیتے ہیں، وہ اس طرف آکر کھڑے ہو جاتے ہیں آپ تحقیق کرواتے ہیں کہ ان کی دماغی حالت خراب تو نہیں؟ جب معلوم ہوتا ہے کہ صحیح الدماغ آدمی ہیں تو آپ ان کو سزا دلواتے ہیں۔ کس چیز نے ان کو سزا پر آمادہ کیا اور کون سی چیز ان کو کھینچ کر لائی؟

آگے چلئے غامدیہ ایک ان پڑھ عورت تھیں کسی گاؤں کی رہنے والی، وہ ایک بار بڑے گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں، نہ کوئی دیکھنے والا تھا نہ سننے والا۔ مگر ان کے دل میں ایک پھانس تھی جو ان کو چین نہ لینے دیتی تھی۔ ان کو کھانے پینے میں مزا نہ آتا تھا۔ وہ کھانا کھاتیں تو ان کا دل کہتا کہ تم ناپاک ہو، ناپاک کا کیا کھانا پینا، تمہیں پہلے پاک ہونا چاہیے۔ اس گناہ کی پاکی سزا کے بغیر ممکن نہیں، وہ خود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں اور تقاضا کرتی ہیں کہ ان کو پاک کر دیا جائے اور اس پر اصرار کرتی ہیں، یہ معلوم کر کے کہ ان کے پیٹ میں بچہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس بچہ کا کیا قصور، اس کی جان تمہارے ساتھ کیوں جائے؟ جب یہ ہو جائے تب آنا، خیال کیجئے ان کو ضرور اس میں کچھ عرصہ لگا ہوگا، کیا انہوں نے کھایا پیا نہ ہوگا، کیا زندگی نے خود ان سے تقاضا نہ کیا ہوگا، کیا خود کھانے پینے کی لذت نے زندگی کی رغبت نہ پیدا کی ہوگی اور ان کو یہ نہ سمجھایا ہوگا کہ اب وہ حضور ﷺ کے پاس جانے کا ارادہ فسخ کر دیں مگر وہ اللہ کی بندی پکی رہی اور کچھ عرصہ کے بعد بچہ کو لے کر آئی اور عرض کیا کہ حضورؐ! میں اس سے فارغ ہو گئی، اب میری طہارت میں کیوں دیر ہے؟ فرمایا: نہیں نہیں، ابھی اس کو دودھ پلاؤ۔ جب دودھ چھوٹے تب آنا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کو دو برس تو ضرور لگے ہونگے، یہ دو برس کیسی آزمائش کے تھے، نہ پولیس تھی نہ نگرانی، نہ مچلکہ ضمانت۔ کتنے خیال اس کو آئے ہونگے۔ بچہ کی معصوم صورت اس کو جینے کی دعوت دیتی ہوگی۔ اس کی مسکراہٹ زندگی کی خواہش پیدا کرتی ہوگی، اور بچہ اپنی زبان بے زبانی سے کہتا ہوگا کہ اماں! میں تو تیری ہی گود میں پلوں گا اور تیری انگلی پکڑ کر چلوں گا۔ مگر اس کا ضمیر کہتا تھا: نہیں، تیری ماں ناپاک ہے، اس کو سب سے پہلے پاک ہونا ہے، دل کا یقین کہتا تھا

کہ احکم الحاکمین کے یہاں جانا ہے، وہاں کی سزا سخت ہے، وہ پھر حاضر ہوئی۔ وہ پھر حاضر ہوئی، روٹی کا ٹکڑا بچے کے منہ میں ہے اور کہتی ہے: یا رسول اللہ! دیکھئے اس بچہ کا دودھ بھی چھوٹ گیا اور وہ روٹی کھانے کے قابل ہوگیا ہے۔ اب میری پاکی میں کیا دیر ہے؟ آخر خدا کی اس بچی اور پکی بندی کو سزا دی جاتی ہے اور اور حضور ﷺ خوشنودی کا پروانہ عطا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس نے ایسی سچی توبہ کی ہے کہ اس اکیلی توبہ کی اگر سارے مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لئے کافی ہو۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاہا۔

میں پوچھتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جو بغیر ہتھکڑی بیڑی کے، بغیر مچلکہ وضمانت کے، بغیر پولیس کے اس کو کھینچ کر لاتی ہے اور سزا کے لئے اصرار کرواتی ہے؟ آج ہزارہا پڑھے لکھے، قابل فاضل مرد اور عورتیں ہیں جن کا علم اور نقصانات کا یقین ان کو غلط کام سے باز نہیں رکھ سکتا اور اچھے کام پر آمادہ نہیں کرسکتا۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے دنیا کو یہی تینوں موتی عطا کیے۔ علم صحیح، یقین کامل اور نیکی کا تقاضائے قلبی، دنیا کو نہ اس سے قیمتی سرمایہ ملا، نہ کسی نے اس پر آپ سے بڑھ کر احسان کیا۔ دنیا کے ہر انسان کو فخر کرنا چاہیے کہ ہماری نوع انسانی میں ایسا انسان پیدا ہوا جس سے انسانیت کا سر اونچا اور نام روشن ہوا، اگر آپ نہ آتے تو دنیا کا نقشہ کیا ہوتا اور ہم انسانیت کی شرافت وعظمت کے لئے کس کو پیش کرتے؟ محمد رسول اللہ ﷺ ہر انسان کے ہیں۔ محمد رسول اللہ سے اس دنیا کی رونق اور نوع انسانی کی عظمت ہے، وہ پوری انسانیت کا سرمایہ فخر ہیں، کیوں آج کسی ملک کا انسان فخر ومسرت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ میرا اس نوع سے تعلق ہے جس میں محمد رسول ﷺ جیسا انسان کامل پیدا ہوا؟

آج انسانوں کا کون سا طبقہ ہے جس پر آپ کا براہ راست یا بالواسطہ احسان نہیں، کیا مردوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کو مردانگی اور آدمیت کی تعلیم دی؟ کیا عورتوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق بتلائے اور ان کے لئے ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ: ''جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے''۔ کیا کمزوروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کی حمایت کی اور فرمایا کہ ''مظلوم کی بددعا سے ڈرو کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ خدا کہتا ہے کہ میں شکستہ دلوں کے پاس ہوں''۔ کیا طاقتوروں اور حکمرانوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق وفرائض بھی بتلائے اور حدود بھی بتلائے اور انصاف

کرنے والوں اور خدا سے ڈرنے والوں کو بشارت سنادی کہ بادشاہ منصف رحمت کے سایہ میں ہوگا، کیا تاجروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے تجارت کی فضیلت اور اس پیشے کی شرافت بتلائی اور خود تجارت کرکے اس گروہ کی عزت بڑھائی کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اور راست گفتار اور دیانتدار تاجر جنت میں قریب ہونگے، کیا آپ کا مزدوروں پر احسان نہیں کہ آپ نے تاکید فرمائی کہ ''مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو''۔ کیا جانوروں تک پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ہر وہ مخلوق جو جگر رکھتی ہے اور جس میں احساس و زندگی ہے اس کو آرام پہنچانا اور کھلانا پلانا بھی صدقہ ہے کیا ساری انسانی برادری پر آپ کا احسان نہیں کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ شہادت دیتے تھے کہ خدایا! تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں۔

انا شہید ان العباد کلہم اخوۃ۔ کیا ساری دنیا پر آپ کا احسان نہیں کہ سب سے پہلے دنیا نے آپ ہی کی زبان سے سنا کہ خدا کسی قوم، نسل و برادری کا نہیں سارے جہانوں اور دنیا کے سب انسانوں کا ہے جس دنیا میں اریوں کا خدا یہودیوں کا خدا، مصریوں کا خدا ایرانیوں کا خدا کہا جاتا تھا۔ وہاں **الحمد اللہ رب العالمین** کی حقیقت کا اعلان ہوا اور اس کو نماز کا جز بنا دیا گیا۔

ہماری آپ کی دنیا می نحکماء و فلاسفہ بھی آئے، ادباء و شعراء بھی فاتح و کشور کشا بھی، سیاسی قائد اور قومی رہنما بھی، موجدین و مکتشفین (سائنٹسٹ) بھی، مگر کس کے آنے سے دنیا میں بہار آئی جو پیغمبروں کے آنے سے؟ پھر سب سے آخر سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کے آنے سے آئی۔ کون اپنے ساتھ وہ شادابی، وہ برکتیں، وہ رحمتیں نوع انسانی کے لئے وہ دولتیں اور انسانیت کے لئے وہ نعمتیں لے کر آیا جو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے؟ تیرہ سو برس کی انسانی تاریخ پورے وثوق کے ساتھ آپ کو خطاب کرکے کہتی ہے:

سر سبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

ارواح کی مدد

معین باری

پاکستان کے پہلے کمانڈر انچیف جنرل اکبر خان راقم کے کزن، میاں عبدالحمید اختر ایڈووکیٹ کے ہم جماعت اور بے تکلف دوست تھے..... وہ کئی کتابوں کے مصنف اور اپنے نام کے ساتھ "رنگروٹ" لکھتے۔ اکبر خاں کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ وہ جب چھٹی پر آتے تو میاں عبدالحمید سے ملنے محلہ دھوبی گھاٹ ضرور آتے۔ اکبر خاں انڈین آرمی میں پہلے ہندوستانی تھے جو بریگیڈیئر رینک پر پرموٹ ہوئے۔ ایک دن ان کے پاس بیٹھے ہوئے کہنے لگے "میں برما محاذ پر بریگیڈ کمان کر رہا تھا۔ رات سوتے وقت خواب میں ماں کو دیکھا جنہیں وفات پائے کئی سال گزر چکے تھے۔ ماں نے کہا "یہاں سے آدھ گھنٹہ کے اندر نکل جاؤ۔ میں جاگ اٹھا اور بریگیڈ کو کوچ کا حکم دیا۔ بعض انگریز افسر یہ سن کر تلملا اٹھے۔ آدھی رات کے وقت فوراً بستر گول کر کے نکل جانا انہیں اچھا نہ لگا۔ بہت ناراض دکھائی دے رہے تھے۔ بریگیڈ وہاں سے نکلا ہی تھا کہ جاپانی توپخانہ نے وہاں اتنی بمباری کی کہ ہر چیز تہس نہس ہوگئی..... انگریز پوچھتے ہی رہے کہ اس حملہ کی اطلاع تمہیں کس نے دی"۔

میرا ہمسایہ حافظ قرآن نوجوان شیخ حسن کالج کا طالب علم ہے، نہایت ہی سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ اس کے چند دوست مری سیر کے لئے گئے۔ پہاڑوں جنگلات کی فوٹو گرافی کرتے گئے۔ پھر ایک پہاڑی کے اوپر چیل اور دیار کے درختوں کے جھنڈ میں فوٹو گرافی کرنے لگے۔ واپس آ کر مری سے تصاویر بنوائیں۔ ان تصاویر میں گروپ کے پیچھے ایک عورت نما چیز کو دیکھا گیا۔ ہر تصویر میں وہ عورت ایک ہی لڑکے کے پیچھے کھڑی تھی۔ واپسی پر راستے میں ہی اس لڑکے کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ فیصل آباد گھر پہنچنے کے دوسرے دن وہ فوت ہوگیا۔ ان طالب علموں میں سے کسی نے اس عورت کو مری کے پہاڑوں میں کہیں نہیں دیکھا تھا۔ ساتھی طالب علموں نے وہ فوٹو انٹرنیٹ پر ویب سائٹ پر دی ہے۔ عورت کے بال کھلے اور آگے کی طرف ہیں۔ چوغا پہنے ہوئے ہے، چہرہ دیکھ کر خوف آتا ہے۔ 4 ماہ بعد میری بھانجی ثروت کا لاہور سے ٹیلی فون آیا کہنے لگی "سعید کو خواب

آیا ہے، امی ملی تھیں۔ انہوں نے کہا معین کی خبر لو وہ بہت تکلیف میں ہے۔ پھر وہ آپ کو فون کرنے لگیں، ثروت نے کہا "اسی خواب میں سعید نے آپ کی کوٹھی بیچی اس پر کالے بال بچھائے ہیں اور بجلی کر رہی ہے۔ ماموں آپ کچھ کریں" میری نانی آپا شریا کو فوت ہوئے سال گزر چکا ہے۔ سعید فلائٹ لیفٹیننٹ منیب شہید کا بیٹا ہے میں نے جواب دیا "بیٹی اگر کوئی آفت یا موت آئی ہے تو میں اسے ٹال نہیں سکتا اس لئے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"..... اس خواب کے کچھ عرصہ بعد میری کوٹھی بک گئی نئے خریدار نے توڑ پھوڑ کر لیول کر دیا۔ وہ وہاں اپنی پسند کی کوٹھی تعمیر کرے گا۔

ان واقعات سے میں نے یہ اخذ کیا کہ ہمارے نیک بزرگ اور عزیز و اقارب مرنے کے بعد بھی بعض اوقات ہماری مدد کو آتے ہیں۔ ان کی روحیں مشکل اوقات میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ طالب علم کی بے وقت موت سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات آفاقی بلائیں بھی موت کا موجب بن جاتی ہیں۔ بھوتوں اور جنوں کے واقعات ہم بچپن میں سنا کرتے تھے لیکن کسی کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ اسلام آباد میں سپر مارکیٹ سے ایک مغربی سیاح اور مصنف کی کتاب مل گئی جس کا نام تھا **Mystries of the Soul** اس میں ایسے مشہور لوگوں کی تصاویر دی ہوئی تھیں جنہیں وفات پائے سالوں بیت گئے تھے۔ لیکن وہ اپنے ممالک کے بڑے فنکشنوں میں دکھائے گئے۔ جنہیں انسانی آنکھ تو نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن کیمروں کی آنکھ نے انہیں ریکارڈ کر لیا۔ ایسی تصاویر کو دیکھ کر دل کو یقین نہ آیا کہ ان میں کوئی اصلیت بھی ہو سکتی ہے... پھر کوہ مری کا قصہ سن کر اور فوٹو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ شاید ایسے بھی ہو سکتا ہے..... وہ ڈراؤنی شکل والی عورت کسی کی روح تھی۔ جنات میں سے تھی، یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ قرآن میں ذکر ہے "ہم نے انسان کو مٹی اور جنات کو آگ سے بنایا" قرآن میں جن و انس کو مخاطب کیا گیا ہے اور بعض ماہر فلکیات کا دعویٰ ہے کہ ہماری کہکشاں میں ایسے سیارے بھی ہیں جہاں صرف جنات کا بسیرہ ہے۔ ان کی اپنی تہذیبیں اور شہر آباد ہیں جنہیں انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔

علماء اور مشائخ کے لئے

ڈاکٹر طاہر مسعود

ایک مرتبہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک مدینہ طیبہ پہنچے اور چند روز قیام کیا اور لوگوں سے دریافت کیا کہ مدینہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے کسی صحابی کی صحبت پائی ہو۔ لوگوں نے بتایا: ہاں ابواز حام ایسے شخص ہیں۔ سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو بلوالیا۔ جب وہ تشریف لائے تو سلیمان نے کہا کہ اے ابواز حام یہ کیا بے مروتی اور بے وفائی ہے؟ ابواز حام نے کہا آپ نے میری کیا بے مروتی اور بے وفائی دیکھی ہے؟ خلیفہ نے کہا کہ مدینے کے سب مشہور لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے۔ ابواز حام نے کہا: ''امیر المومنین! میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہو۔ آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقف تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا۔ ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بے وفائی کیسی؟ خلیفہ سلیمان نے جواب سن کر ابن شہاب زہری اور حاضرین مجلس کی طرف دیکھا تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابواز حام نے صحیح فرمایا، آپ نے غلطی کی۔ اس کے بعد خلیفہ نے روئے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا اے ابواز حام! یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو ویران اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے ویرانہ میں جانا پسند نہیں۔ خلیفہ نے تسلیم کیا اور پوچھا: کل اللہ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ ابواز حام نے فرمایا: نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسے کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے اور برے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا جیسا کوئی بھاگا ہوا غلام پکڑ کر آقا کے پاس حاضر کیا جائے۔ خلیفہ یہ سن کر رو پڑا اور کہنے لگا کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے؟ ابواز حام نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کرو تو پتہ لگ جائے گا۔

خلیفہ نے دریافت کیا کہ قرآن کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے ''بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنت کی نعمتوں میں ہیں اور نافرمان، گناہ شعار دوزخ میں''۔ خلیفہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ بدکاروں پر بھی حاوی ہے۔ ابواز حام نے فرمایا: قرآن میں آیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے''۔

خلیفہ سلیمان نے پوچھا: ''اے ابواز حام! اللہ کے بندوں میں سے زیادہ کون عزت والا ہے؟ فرمایا: ''وہ لوگ جو مروت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں''۔ پھر پوچھا: ''کونسا عمل افضل ہے؟'' تو فرمایا کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی حرام چیزوں سے بچنے کے ساتھ۔ پھر دریافت کیا کہ کونسی دعا زیادہ قابل قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا ہو، اس کی دعا اپنے محسن کے حق میں قبولیت رکھتی ہے۔ پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ نہ اس سے پہلے احسان جتائے اور نہ ٹال مٹول کر کے ایذا پہنچائے۔

خلیفہ نے پھر دریافت کیا کلام کونسا افضل ہے؟ ابواز حام نے فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو اور امید وابستہ ہو، اس کے سامنے بغیر کسی رورعایت کے حق بات کہہ دینا۔ پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیا ہے؟ فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔ پھر پوچھا مسلمانوں میں کونسا شخص احمق ہے؟ فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسرے کی دنیا درست کرنے کے لئے اپنا دین بیچ دیا۔ سلیمان نے کہا کہ صحیح فرمایا۔ اس کے بعد خلیفہ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابواز حام نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے۔ خلیفہ نے کہا نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔ ابواز حامؒ نے فرمایا:

اے امیر المومنین! تمہارے آباؤ اجداد نے بزور شمشیر لوگوں پر تسلط حاصل کیا اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کاش! آپ کو معلوم ہوتا کہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں اور ان کو کیا کہا جاتا ہے؟

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابواز حام کی اس صاف گوئی کو سن کر کہا کہ ابواز حام! تم نے یہ بہت بری بات کہی ہے۔ ابواز حام نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بری بات نہیں کہی بلکہ وہ بات کہی جس کا ہم کو حکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے چھپائیں گے نہیں۔ خلیفہ سلیمان نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟

فرمایا کہ تکبر چھوڑ دو، مروت اختیار کرو اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کرد۔ خلیفہ نے کہا ابواز حام کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں۔ فرمایا: خدا کی پناہ! خلیفہ نے پوچھا یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عزت و جاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجہ میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

خلیفہ سلیمان نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلایئے کہ ہم اس کو پورا کریں۔ فرمایا! ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلا دو اور جنت میں داخل کر دو۔

خلیفہ نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں۔ فرمایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔ آخر میں خلیفہ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دعا کیجئے تو ابواز حام نے یہ دعا کی یا اللہ اگر سلیمان آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کو دنیا و آخرت کی بہتری کی طرف لے آ۔

خلیفہ نے التجا کی کہ مجھے کچھ وصیت فرما دیں۔ ارشاد فرمایا: مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی عظمت و جلال اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ خلیفہ نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد سو دینار بطور ہدیہ کے ابواز حام کے پاس بھیجے۔ ابواز حام نے ایک خط کے ساتھ ان کو واپس کر دیا۔ خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ سو دینار میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے اور اگر اس لئے بھیجا ہے کہ بیت المال میں میرا حق ہے تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے ہیں۔ اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں، ورنہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے معارف القرآن جلد اول میں امام قرطبی کی تفسیر کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے اور مجھے اس بارے میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کرنا کہ صدر مملکت بھی ہمارے علماء اور مشائخ کو طلب فرما کر گاہے گاہے ان سے خطاب فرماتے رہتے ہیں لیکن کیا کوئی عالم دین اور کوئی مرشد و شیخ ایسا ہے جو اس طرح ''امیر المومنین'' کو مخاطب کر سکے جس طرح ابواز حام تابعیؒ نے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کو کیا....

یہ مقام لمحہ فکریہ ہے! علماء اور مشائخ کے لئے!!

بشکریہ نوائے وقت

اسلام اور عسکریت

کے اہم اعظم

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ عموماً دینی نظریاتی اختلافات کے در پردہ پیچ وتاب کھاتے ہوئے طبقاتی معاشرتی ومعاشی مفادات ہوتے ہیں، جو ان مذہبی اختلافات کی آگ کو بھڑکائے رکھتے ہیں۔

ہر چیکہ اسلام کا انقلاب دنیا کے عظیم ترین انقلابوں میں سے تھا، مگر اس کا طریق کار روایتی انقلابوں جیسا نہ تھا کیونکہ اس نے قبل از انقلاب کے حکمران طبقہ کو تہ تیغ کرنے کی بجائے اسلام میں شامل کر لیا تھا اور عام معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ اگرچہ اکابر صحابہ کرامؓ نے فتح مکہ پر فرمایا تھا کہ آج بدلہ لینے کا دن ہے، مگر رسول عالی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہیں، آج عفو و درگذر کرنے کا دن ہے۔ بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حق بجانب ہوتے اگر وہ سب دشمنان اسلام کی گردنیں اڑانے کا حکم صادر فرما دیتے اور ان کی تمام دولت بحق اسلام ضبط فرما لیتے۔ مگر آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہ کیا بلکہ مکہ کے مشہور زمانہ تاجروں کا تجارتی اور انتظامی تجربہ بے پناہ سرمایہ اور فن سپہ گری اسلام کی خدمت میں بروئے کار لے آئے۔ بہر حال نتیجتاً اسلامی معاشرہ میں اوائل سے ہی دو طبقات موجود رہے، جو سیدنا عمرؓ کی شہادت کے بعد **فتنة الكبرى** میں نمایاں ہوئے۔ ایک طبقہ مکہ کے زیادہ تر اموی امراء کا تھا جو اسلام کے آنے سے پہلے بھی مالدار اور طاقتور تھے اور جنہوں نے فتح مکہ پر اسلام قبول کیا تھا۔ دوسرا طبقہ ان افراد پر مشتمل تھا، جنہوں نے شروع میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا اور جن کی دولت اور عزت ساری کی ساری اسلام ہی کی وجہ سے تھی۔ تاریخ اسلام پہلے طبقہ کو طلقاء اور دوسرے کو السابقہ فی الاسلام یا اہل ایام کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اگر ہم اس طبقاتی تفریق کو نظر انداز کر دیں گے تو ہم اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کو پوری طرح سے سمجھنے سے قاصر رہیں گے، مثلاً سیدنا عثمانؓ کے خلاف بغاوت، جنگ جمل، جنگ صفین، سانحہ کربلا، اہل بیت کی عقوبت اور اکابر صحابہ کرامؓ سے بدسلوکیاں۔

ہم ہندی الاصل لوگوں کی ایک خامی یہ ہے کہ اخلاقی طور پر پست ہونے کے باوجود ہم عینیت پسندی میں بہت آگے بڑھے رہتے ہیں۔ اس کی ایک تاریخی وجہ شاید یہ ہے کہ ہندو مت کے اشراف، اوتار اور بھگوان ہوتے تھے جبکہ اسلام میں فقط ایک نبی علیہ السلام ہی معصوم ہوتا ہے

یا پھر فقہ جعفریہ کے مطابق چند گنے چنے امام۔ جبکہ باقی سب افراد مائل بہ عصیاں انسان ہوتے ہیں۔ یہ اسی رویہ کی وجہ ہے کہ ہمیں اسلامی تاریخ کے نشیب و فراز سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

جہاں تک اسلام کے مثالی دور کا تعلق ہے، تو اس دور کا تو کوئی مقابلہ نہیں ہوسکتا جس میں حضور اکرم ﷺ بہ نفس نفیس موجود تھے۔ حضور ﷺ کا مدنی دور دس سال کا ہے اس کے بعد شیخین کا بارہ سال دور ہے، جس میں سیدنا عمرؓ کی شخصیت اور دبدبہ نے مسلمانوں کو راہ راست پر رکھا۔ اس طرح رسول اکرم ﷺ اور شیخین کا 22 سالہ دور ہے یا پھر خلافت راشدہ کے 30 سال لے لیں تو کل 40 سال بنتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کی 1420 سالہ تاریخ میں صرف 22 سال کا دور یا پھر 40 سال کا دور ہے جسے مثالی کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال اگرچہ اسلام کا مثالی دور تو دیرپا ثابت نہ ہوا، مگر دنیاوی جاہ و جلال کے میدان میں اموی اور عباسی خلافتوں نے مسلمانوں کے اقتدار کا ستارہ عروج پر پہنچا دیا۔ اموی اور عباسی سلطنتوں سے بڑی سلطنت دنیا نے کبھی نہ دیکھی تھی اور مسلمانوں کی ہفت اقلیم، خلافت عثمانیہ کی شکل میں بیسویں صدی کے شروع تک قائم و دائم رہی۔ یہ اسلام کی ملوکیت ہی کا ثمر ہے کہ آج ہم ہندی الاصل لوگ مسلمان ہیں ورنہ شاید مثالی اسلام جزیرہ نما عرب تک ہی محدود ہو کے رہ جاتا۔

اسلامی فتوحات کا انحصار جہاد پر تھا، جو ایک دینی فریضہ بھی تھا اور روزی کمانے کا ذریعہ بھی۔ مگر یہ بے ربط لوٹ مار کا ذریعہ نہ تھا۔ یہ باقاعدہ منصوبہ کے تحت مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے شروع کیا جاتا، جیسا کہ بے شمار عہد ناموں اور معاہدوں سے ظاہر ہوتا ہے جو مفتوح علاقوں کے باشندوں سے کئے گئے۔ جہاد کے ذریعے حاصل کیا گیا مال غنیمت ایک پلان کے تحت ہر عام و خاص میں ان کے مقام کی حیثیت سے بانٹ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ اسلام تھا جس نے حجاز کے تاجروں کا سرمایہ یکجا کیا اور یہ اسلام ہی تھا جس نے فتوحات کے ذریعے حاصل کی ہوئی دولت کو اسکی فلاح و بہبود کے لئے لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ ملوکیت کے طویل دور میں جہاد کی صفت وہ نہ رہی ہوگی، جو رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں تھی۔ مثال کے طور پر سیدنا عمرؓ بحری مہم کے آغاز کے حق میں نہ تھے۔ اس لئے اصرار کے باوجود انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کو اس کے شروع کرنے کی اجازت نہ دی۔ سیدنا عمرؓ ایک طرف تو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی دولت اور روایتی تاجران مکہ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پریشان تھے تو دوسری طرف ان

کا اولین سروکار اسلامی ریاست کا استحکام اور دولت کی عادلانہ تقسیم کے لئے ایک مثبت نظام کے قیام کا تھا۔ اس کے برعکس خلیفہ ثالث سیدنا عثمانؓ روایتی تاجران کی طرف مائل تھے، جن کے مفادات ریاست کی وسعت اور فاضل پیداواری علاقوں، منڈیوں اور بحر ابیض کے راستوں پر کنٹرول میں تھے۔

وسعت پذیر اسلامی فتوحات اور عرب اور عجمی مسلمانوں کے درمیان حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (عمر ثانی) کی قائم کردہ مساوات نے مسلمانوں کی دولت و ثروت میں بے پناہ اضافہ کیا، جس نے خلافت عباسیہ کی پہلی صدی کو اسلام کا سنہری عہد بنا دیا۔ مگر تیسری صدی ہجری میں ایک طرف تو عالم اسلام میں سرمایہ کاری کا بے پناہ عروج ہوا تو دوسری طرف خلافت عباسیہ کے مختلف علاقوں میں مزارعوں کی دیرپا بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ یہ بغاوتیں حکومت اور زمینداروں کے مفادات کے لئے براہ راست خطرہ کی گھنٹی تھیں۔ ۱۹۵ تا ۱۹۹ ہجری کی خانہ جنگی میں خلیفہ المامون کی فتح زمینداروں کے لئے ایک مزید خطرہ کا اعلان تھی۔ خلیفہ المامون نے معتزلہ عقیدہ کو اپنا لیا تھا، جس کے زیادہ تر حلیف اور حامی تاجر اور سوداگر تھے۔ معتزلہ قرآن حکیم کو مخلوق تصور کرتے تھے اور اس غطرسہ کو مقبول بنانے کے لئے محنہ کو اپنایا گیا۔ خلیفہ وقت کے احکامات کے مطابق اس ریاستی عقیدہ کو نہ ماننے والوں کو سرکاری ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ ان کی تعیناتی بطور منصف کے ہو سکتی تھی اور نہ ہی ان کی گواہی قابل قبول تھی۔ اس طرح سے ان کو سیاسی عمل سے بے دخل کر دیا گیا۔

خلق قرآن کے عقیدہ کے خلاف بلند ہونے والی آوازوں میں سب سے معتبر آواز امام احمد بن حنبلؒ کی تھی، جو بذات خود ایک چھوٹے زمیندار تھے۔ خلیفہ نے موصوف امام اور ان کے پیروکاروں کو ان کے قضا کے عہدوں سے فارغ کر دیا اور ان کی جگہ معتزلی فقہا کی تقرریاں عمل میں لائی گئیں۔ خلیفہ المامون (۱۹۵۔۲۱۸ھ)، خلیفہ المعتصم باللہ (۲۱۸۔۲۲۷ھ) اور خلیفہ الواثق باللہ (۲۲۷۔۲۳۳ھ) تینوں خلفاء نے حکومت کی سب اعلیٰ اسامیوں پر معتزلی علماء کی تقرریاں کیں، جن میں زیادہ تر تجارت کے پیشہ سے تعلق رکھتے تھے یا پھر کاریگر اور دستکار تھے۔ یہ بات اور بھی خصوصیت اختیار کر لیتی ہے جب ہم معتزلی اور حنبلی عقیدوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ یہ تجزیہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ معتزلی، حنبلی اختلافات صرف دینی عقیدوں کا اختلاف ہی نہ

تھا بلکہ یہ ایک معاشرتی اختلاف تھا جو کہ ایک نظریاتی سطح پر لڑا گیا۔

معتزلہ اور ان کے عقیدہ کو اپنانے والے خلیفہ المامون کے مدنظر اسلام کے نظریاتی اور قانونی ڈھانچے میں تبدیلی لانا تھا۔ معتزلہ نے حدیث اور سنت رسول اللہ ﷺ کو رد کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ فقط کلام اللہ ہی کو قانون اسلامی کا معتبر ماخذ مانا جا سکتا ہے۔ مگر کیونکہ قرآن کریم بھی زمان و مکان میں تخلیق کیا گیا ہے، اس لئے اس کی نوعیت بھی زمانی ہے اور عقلی تعبیر کی پابند ہے۔ ظاہر ہے ایسا عقیدہ خلیفہ وقت کو قرآن حمید اور حدیث و سنہ کی حدود کے باہر قانون سازی کرنے کا مجاز بنا دیتا ہے اور اس عہدہ کو اضافی اختیارات عطا کر دیتا ہے اور اس طرح خلیفہ وقت عوام پر جو بھی غیر شرعی ٹیکس چاہے عائد کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ معتزلہ کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کو مکمل اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے کہ وہ اللہ کے تخلیق کئے ہوئے عمل کو بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ انسان کی طاقت اور اہلیت کے اس تصور کے سامنے اللہ تعالیٰ کی صفات صرف توحید اور انصاف تک محدود ہو کے رہ جاتی ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے رفقا کے حدیث اور سنہ کے جواز اور انسان کے مقام کے متعلق خیالات اس کے بالکل برعکس تھے۔ بہر حال ہمیں اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان دونوں دبستانوں کے دلائل اسلامی تعلیمات کی حدود کے باہر نکل نہ پاتے تھے اور دونوں قرآنی آیات کو ہی اپنے اپنے دلائل کی اساس بناتے تھے۔ کیونکہ دونوں مدرسہ ہائے فکر اسلام ہی سے تعلق قائم رکھے ہوئے تھے، اس لئے فیصلہ کا دارومدار اس بات پہ جا ٹھہرتا تھا کہ خلیفہ وقت کی اعانت کس دبستان کو حاصل ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا تین خلفاء کے دور حکومت میں معتزلہ کا طوطی بولتا رہا، مگر جب المتوکل باللہ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوا (۲۳۳ـ۲۴۷ھ)، تو معتزلہ کا آفتاب اقتدار غروب ہو گیا اور امام احمد بن حنبلؒ کو حبس بے جا سے آزاد کر کے دستار فضیلت ان کے سر پہ رکھ دی گئی۔

اس نظریاتی اختلاف کی سیاسی نوعیت کے حقیقی مظہر کے طور پر خلیفہ المتوکل نے معتزلی اور تاجر وزیر اعظم ابن زیات کو معطل کر کے اس کی جگہ ابو الفضل الجرجرائی جن کا تعلق ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تھا، متعین کر دیا۔ نئے وزیر اعظم نے اپنے منتظمین اعلیٰ سب کے سب زمیندارانہ پس منظر سے متعلق لوگوں میں سے ہی منتخب کئے۔ چنانچہ اس نظریاتی تبدیلی کی وجہ سے زمام

اقتدار حقیقی طور پر جاگیردار امراء کے طبقہ کے ہاتھوں میں آ گئی۔ جاگیردار اشرافیہ کے ساتھ ساتھ عسکری سردار بھی اقتدار اعلیٰ میں شریک کار ہو گئے اور اس طرح عسکری حکومتوں نے مدنی (سولین) حکومتوں کی جگہ لے لی۔ فوجیوں کو اس مقصد کے لئے بھرتی کیا گیا کہ مزراعوں کو زرعی زمینوں پر پرامن رکھیں، تاکہ وہ اپنے مالکان زمین کے لئے فصلیں پیدا کرتے رہیں۔ اس جاگیرداری اور عسکری اتحاد کے تحت ریاست کو بھی زمینوں پر ٹیکس وصول کرنے میں آسانی ہو جاتی۔ ویسے بھی ریاست کے لئے زمینوں کی شکل میں رویت پذیر دولت پر ٹیکس لگانا، تاجروں اور سوداگروں کی چھپی ہوئی دولت پر ٹیکس لگانے سے آسان تھا۔ جاگیرداری، عسکری نسبت کی وجہ سے خلیفہ زمینوں پر شرعی ٹیکس کے علاوہ کوئی اور ٹیکس لگانے کا مجاز نہ رہا تھا۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تاریخ کے اس موڑ پر خلیفہ المتوکل نے عسکری جاگیرداری (اقطاع) کا رواج ڈالا تاکہ فوج شوایدہ سر مزراعین کو قابو میں رکھ سکے۔

المتوکل کا عہد خلافت عباسی کی تاریخ کے ایک اہم موڑ کی نشان دہی کرتا ہے۔ جب خلفاء اسلام معتزلہ غطرسہ کے طفیل اپنی طاقت میں اضافہ کرنے میں ناکام رہ گئے تو عسکریت نے ان کے وقار و اقتدار کا جنازہ نکال دیا اور مدنی حکومت کا تصور ایک خیال خام بن کر رہ گیا۔ یہ فقط اتفاق نہیں کہ الاشعری معتزلہ سے اپنا رشتہ توڑ کر پرجوش حنبلی بن کر عسکری خاندان بنو بویہ (بغداد ۳۳۴۔ ۴۴۷ھ) کا مدح سرا بن گیا، جن کا امیر الامراء خلافت عباسیہ کا حقیقی حکمران بن بیٹھا اور خلفاء جو ایک وقت، ایک دنیا پر حکمران تھے، بنو بویہ کے کارندے بن کے رہ گئے اور ان کی حیثیت ایک قانونی کٹھ پتلی سے زیادہ نہ رہی۔ عسکری اشرافیہ کی حیثیت سے بنو بویہ نے بھی اقطاع کا نظام اپنی جگہ قائم رکھا۔ ہر چیکہ اپنے عہد کی ابتداء میں انہوں نے معیشت کے احیا کی کوششیں کیں مگر زیادہ تر مراعات کا غلط فائدہ اٹھایا۔ ٹیکسوں میں تو اضافہ کیا مگر نظام آبپاشی کے استقرار پر توجہ نہ دی۔ چنانچہ وقت آنے پر عسکری سلجوقی ترکوں نے انہیں بڑی آسانی سے برطرف کر کے زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی اور ان کی حکومت بغداد میں ۴۴۷ سے ۵۹۱ھ تک قائم رہی۔

سلجوقیوں نے بھی عسکری اقطاع کا نظام برقرار رکھا، بلکہ ان کے مشہور وزیر اعظم "نظام الملک" نے اس نظام کو مزید تحفظ اور ترقی دی حتیٰ کہ جاگیریں وراثتیں بن گئیں اور زمین کی

وراثت ہی نظام حکومت میں داخل ہونے کا واحد ذریعہ بن گئی۔ سلجوقیوں نے خلفاء کے عہدہ کی زیادہ تو قیر کی مگران کی حیثیت عسکری حکمرانوں جن کو اب سلطان کہا جانے لگا تھا، کے ماتحت کے طور پر ہی رہی۔ تجارت بھی ترقی پذیر رہی مگر تاجروں کا کوئی اہم سیاسی رول نہ رہا جبکہ کئی تاجروں کے پاس بے شمار دولت تھی۔

جب خلافت کا کوئی اہم رول نہ رہا تو علاقائیت نے خلافت عباسیہ پر غلبہ حاصل کرلیا۔ مختلف علاقوں نے جن کے پاس خاطر خواہ وسائل تھے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں اور خلافت کا کام بس ان حکومتوں کو سند قبولیت عطا کرنا رہ گیا۔ بے شمار علاقائی عسکری خاندان ظہور پذیر ہوگئے۔ جس کسی عسکری سردار کے پاس معقول معتقدوں کی تعداد جمع ہو جاتی، وہ کسی علاقہ پر اپنی حکومت قائم کرکے خلیفہ وقت سے سند حکومت حاصل کرلیتا۔ خلافت عباسی بھی بے مثل نہ رہی اور کئی ایک متبادل خلافتوں نے جنم لے لیا مثلاً قاہرہ میں فاطمی خلافت ۳۶۰ سے ۵۶۷ھ تک قائم رہی، جبکہ اندلس میں امیہ خلافت ۴۳۲ھ تک قائم رہی۔ اس کے علاوہ شمالی افریقہ میں بھی کئی ایک خلافتیں قائم ہوگئیں۔

سیاسی علاقائیت نے اسلامی مارکیٹ کو بھی علاقائی منڈیوں میں تقسیم کردیا، جس کی وجہ سے خلافت عباسیہ کے اندر علاقائی سیاسی، عسکری اور اقتصادی مقابلہ بازی شروع ہوگئی۔ بڑھتی ہوئی عسکری جاگیرداری (اقطاع) اور جنگی کشمکش کی وجہ سے خلافت کے قدرتی اور معاشی وسائل میں کمی آنا شروع ہوگئی اور اقتصادی تعمیر نو کا کام مشکل ہوتا گیا۔ مسلمان تاجر جو کبھی یورپ کی معاشی احیاء کا موجب بنے تھے، اب ان کی یورپ تک رسائی بھی ناممکن ہوتی چلی گئی۔ کئی صدیوں کے بعد بوزنطیہ ایک بار پھر شامی ساحل پر قابض ہوگئے۔ اطالوی سوداگروں نے پہلے اسکندریہ اور پھر قاہرہ اور پھر جدہ کے بالمقابل اضحاب میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں۔ مسلمان تاجر اور جہاز ران اپنے اردگرد کی منڈیوں کی طلب کو پہلے کی طرح پورا کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ بحیرہ روم اور براعظم ایشیاء کی منڈیوں کو آپس میں باندھنے والی گرہ کمزور پڑ گئی اور لیونٹ کے ساحل پر مخالف سمتوں سے منگول اور صلیبی جنگجو آدھمکے۔

صلیبی جنگ آزما اور منگول ایک عسکری اندیشہ تھے، جن کا مقابلہ ایک تربیت یافتہ اور طاقتور فوج سے ہی کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اب جیش اسلامی کا بے کس مزارعین کی بجائے ایک طاقتور اور

خونخوار دشمنوں سے پالا پڑ رہا تھا۔ اب اسلامی جیش کو جاگیردار اشرافیہ کے تحفظ کی بجائے قوم، ملک اور سلطنت کو بچانے کا مبا ذرہ درپیش تھا۔ اسلامی لشکر بہر حال ان مقابلوں میں سرخرو ہوئے۔ ایک طرف تو صلیبی جنگوں میں کردی صلاح الدین ایوبی نے یورپی سورماؤں کے چھکے چھڑا دیئے، تو دوسری طرف عین جالوت کے میدان جنگ میں مملوکوں نے منگولوں کے سیل پناہ کی تکہ بوٹی کر دی۔ اس طرح اب عساکر اسلامی کو کسی سے سند جواز کی ضرورت نہ رہی۔ ہر کہ وناقص نے دیکھ لیا تھا کہ اسلامی عساکر ہی مسلمانوں کی جان و مال کے محافظ ہیں۔ اب وہی ان کی آنکھوں کے تارے تھے۔ بہر حال اگر ایک انداز نظر سے دیکھا جائے تو ایک طرف چمکتے ہوئے زرہ بکتروں میں یورپی سورما، جاگیردارانہ یورپ کی نمائندگی کر رہے تو دوسری طرف سیاہ فام مملوک سردار اسلامی جاگیرداری کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں ہتھیلیوں پہ لے کے نکلے تھے۔ مملوک سرداروں (۶۶۰۔۹۲۳ھ) نے صلاح الدین ایوبی کے عسکری جاگیرداری (اقطاع) کو ایک مستقل سیاسی نظام کا درجہ عطا کر دیا۔ عسکری اور جاگیردار اشرافیہ کا یہ اتحاد ایک سیاسی نظام کے طور پر خلافت عثمانیہ کی شکل میں پہلی عالمگیر جنگ کے اختتام تک قائم و دائم رہا۔

ایک طرف تو اس جاگیردارانہ عسکری نظام کا جواز قانون اسلامی میں بھی ڈھونڈ لیا گیا تو دوسری طرف یہ ایک قائم شدہ سیاسی نظام بھی تھا۔ اس دوطرفہ قبولیت کے تحت اس نظام کو بدلنے کے لئے کوئی ترغیب باقی نہ رہی تھی اور اگر کوئی اصلاحی تحریک اٹھی بھی تو عثمانی نظام شہنشاہیت کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی۔ جب کبھی اصلاح کی ضرورت اور سودمندی کا اعتراف کیا گیا تو یا تو بہت تاخیر سے ہوا یا اس کی شدید قانونی مخالفت کی گئی اور پھر وہ وقت آ پہنچا کہ یورپ کے سامراجی تسلط نے عالم اسلام کے ہر ان اداروں اور اقتصادی اور بنیادی ڈھانچوں کو تباہ و برباد کر دیا جو اس کی حاکمیت کے راستے میں حائل تھے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں انیسویں صدی میں یورپی صنعتی سرمایہ نے آسانی سے عالم اسلام میں اپنا اقتصادی تسلط قائم کر لیا اور مقامی معاشی ترقی اور سیاسی قیادت کو پنپنے کا موقعہ نہ دیا گیا۔ بلاد اسلام سے یورپی سامراج کے اخراج کے بعد بھی وہاں پر سامراجی دور کی پروردہ جاگیردارانہ اشرافیہ اور عسکریت نے ہی اپنی حاکمیت قائم رکھی۔ نتیجتاً آج بھی بلاد اسلام میں عسکریت کی جابرانہ قوت کا سیاسی استعمال عام ہے۔

اختتامیہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دین اسلام کا تصوراتی رخ نہ سرمایہ داری کی طرف ہے اور نہ

ہی جاگیرداری کی طرف مگر اسلام کا نظریاتی ڈھانچہ اتنا مشمولہ ہے کہ معاشرہ کی کوئی بھی غالب قوت اس کو اپنے مفاد میں ہتھیا سکتی ہے۔ چنانچہ اسلام کی پہلی دو صدیوں میں جبکہ تجار معاشرتی طور پر ایک غالب طاقت تھے، تو وہ اسلام کے اصولی عقائد کو اپنے مفاد میں بروئے کار لائے۔ عباسی دور خلافت کی پہلی صدی کے دوران جب ریاست کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلیاں آنی شروع ہوئیں تو انہوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اسلامی دلائل کی بنیاد پر ایک حمایتی آئیڈیالوجی کی تشکیل کی مگر وہ جاگیردار اشرافیہ کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ جب جاگیردارانہ اشرافیہ کو سیاسی عروج حاصل ہوا تو انہوں نے بھی اسلام کو ہی اپنے مفاد میں استعمال کیا۔ ان کو اپنے زرعی مفادات کے تحفظ کے لئے فوج کی مدد کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ عساکر کے لئے زرعی زمین عطیات کا نظام (اقطاع) ان کے لئے ایک منطقی حق انتخاب تھا۔ اور اس نظام کو رائج کرنے کے لئے ان کو اسلامی روایت اور تاریخ میں جواز اُمثالیں بھی مل گئیں۔ صلیبی جنگوں اور منگولوں کی یلغار نے عسکریت کے لئے آئینی اور قانونی فضا کو مزید ہموار کر دیا اور مملوکوں کے عروج نے عسکری جاگیرداری کو ایک ریاستی ادارہ کے طور پر قائم کر دیا۔ اسی طرح بیسویں صدی میں قرآن کریم کے نظریاتی تصورات کے تحت دونوں اشتراکیت اور حکومت الٰہیہ یا ملائیت کو جائز قرار دے دیا گیا۔

وہ مفکر جو اسلام کی سرمایہ دارانہ تعبیر کرتے ہیں، اسلام کی پہلی دو صدیوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور ان اداروں اور طریقوں کو چنتے ہیں جو ارتکاز سرمایہ کی حمایت کرتے ہیں اور ان کو ساری اسلامی تاریخ پر مسلط کر دیتے ہیں مگر وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معاشرتی قوتیں متحرک اور تغیر پذیر رہتی ہیں۔ اسی طرح وہ مفکر جو اسلام کو زمینداری یا جاگیرداری کی طرف مائل تصور کرتے ہیں، اسلام کے صرف اس عہد کو دیکھتے ہیں جن میں جاگیردارانہ اشرافیہ برسر اقتدار تھی یعنی سلطنت عثمانیہ اور دور مملوکیت۔ یہ بھی چند ایک اداروں اور طریقوں کا انتخاب کر کے ان کو ساری اسلامی تاریخ پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تاریخ کا مطالعہ اس کے اندرونی تمدنی، حرکیاتی عوامل پر اپنی توجہ مرکوز کر کے کریں۔ ایسا کرنے سے ہی ہمیں اسلامی بلکہ کسی بھی تاریخ کا صحیح شعور حاصل ہوگا۔

اسلامی علم کے تحت ایک تجارتی ریاست قیام پذیر ہوئی جو کئی صدیوں تک قائم رہی، حالانکہ

ان دنوں کی سوچ یہ تھی کہ کسی تجارتی ریاست کا قیام ناممکنات میں سے ہے، کیونکہ تجارک پاس اپنے پیداواری وسائل نہیں ہوتے۔ یورپ میں جاگیردارانہ زرعی نظام کے خاتمے پر پہلے تجارتی سرمایہ کو اور پھر صنعتی سرمایہ کو عروج حاصل ہوا۔ اس کے برعکس اسلامی دنیا میں تجارتی سرمایہ اور اس کے ارتکاز نے جاگیرداری اور اس کے ساتھ عسکریت کو جنم دیا، جس کی وجہ سے یہاں پر صنعتی انقلاب رو پذیر نہ ہوا۔ اسلامی دنیا کی یہ معاشری حرکت اور تبدیلی ان عوامل کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کی وجہ سے انیسویں صدی عیسوی میں بیشتر بلاد اسلام یورپی سامراجی تسلط کا شکار ہوئے اور آج بھی ان معاشرتی اور تمدنی حرکیاتی عوامل کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کی وجہ سے بلاد اسلام کے دور جدید میں بھی عسکریت کو غلبہ حاصل ہے۔

عسکری روایت اسلامی تاریخ کا ایک غالب عنصر ہے، جس کی وجہ سے ہمارے عوامل کا مزاج اور ان کی باطنی قوت محرکہ کا رخ ایک تحکمانہ ''درجہ بند'' شخصیت پرست اور طاقتور معاشرتی اور سیاسی ڈھانچوں کی طرف مائل ہے اور ذہنی طور ان کا رویہ جمہوریت اور مساوات انسانی سے معاندانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلاد اسلام میں جمہوریت کی جڑیں گہری نہیں ہو پاتیں اور عسکری آمریت کو بڑی حد تک مقبولیت حاصل رہتی ہے۔

اسلام کی عالمگیر اخوت انسانی اور احترام آدمیت کا سہانا خواب، جو سیدنا عمر بن خطابؓ کی شہادت اور ملوکیت کے غلبہ کے نظر ہو کے رہ گیا تھا، آج بھی بلاد اسلام میں اپنی تعبیر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ بقول علامہ اقبال ''اسلام تکمیل نہیں، بلکہ ایک تمنا اور آرزو ہے''۔ بے شک اسلام بطور ایک دین کے مکمل و کامل ہے مگر اس کا مشن ابھی پورا ہونا باقی ہے۔ ویسے بھی نبی آخر الزماں ﷺ کا مشن تو قیامت تک جاری و ساری رہے گا ہی۔ اب دیکھنا یہ باقی ہے کہ دور حاضر کے مسلمان کب اور کیسے اس خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں یا پھر یہ فضیلت کسی اور دور کے مسلمانوں کو نصیب ہوگی۔

محمد جان ویبسٹر

(انگلستان)

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

(ذیل کا انٹرویو ماہنامہ ''چراغ راہ'' کراچی کے شمارہ جون 1960ء میں شائع ہوا تھا اور اسے مدیر رسالہ پروفیسر خورشید احمد صاحب نے مرتب فرمایا تھا)

☆☆☆

ویبسٹر سے میری پہلی ملاقات 1958ء میں ہوئی تھی۔ موصوف اسلامی کولوکیم میں شرکت کے لئے لاہور آئے تھے اس لئے لاعلمی کے باعث قادیانیوں کے چکر میں پھنس گئے تھے۔ قادیانیت کے متعلق میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ اسے شعوری طور پر وہی قبول کرسکتا ہے جو یا تو اچھا خاصا غبی ہو یا کوئی مفاد اسے اس طرف لے جائے۔ ویبسٹر میں ان دونوں میں کوئی بھی چیز نہیں تھی، اس لئے چند ہی دنوں میں قادیانیت کا پول ان کے سامنے کھل گیا۔ ربوہ سے وہ مختلف شہروں میں گھومتے ہوئے کراچی تشریف لائے اور ہماری ملاقات چند ہی روز میں اچھی خاصی دوستی میں بدل گئی۔

ویبسٹر میں اور مجھ میں منجملہ اور چیزوں کے ایک چیز یہ بھی مشترک ہے کہ ہم دونوں خط لکھنے کے چور ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال تک آنے جانے والوں کے ذریعے سلام برابر پہنچتے رہے، لیکن کسی نے بھی خط نہ لکھا۔ عید سے دو تین دن پیشتر میں مطالعہ میں مصروف تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے بولنے والے ہمارے دوست سرور صاحب تھے جو کہہ رہے تھے کہ مسٹر ویبسٹر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ٹیلیفون پر ویبسٹر سے اس طرح اچانک گفتگو میرے لئے ایک خوشگوار Surprise تھا۔

ویبسٹر صاحب کراچی میں تقریباً ایک ماہ رہے۔ اس اثناء میں دسیوں اجلاسوں کو خطاب کیا اور بلاشبہ سینکڑوں افراد سے گفتگو کی۔ آج کا ویبسٹر دو سال پہلے ویبسٹر سے بہت مختلف تھا۔ اب اسلام پر اس کا مطالعہ بہت Up to Date ہے اور وہ صرف ایک مسلمان ہی نہیں ایک مبلغ بھی ہے۔ انگلستان میں اس نے ایک تبلیغی مشن میں بھی کام شروع کر دیا ہے اور اس کی مساعی کے نتیجے کے طور پر انگلستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہاں کے مشہور ہائیڈ پارک میں ایک اسلامک

پلیٹ فارم قائم ہوگیا ہے۔ جہاں سے ہفتہ کی ہر شام کو اسلام پر تقاریر ہوتی ہیں اور ان تقاریر کو
ہزاروں افراد سنتے ہیں۔ اس وقت سب سے اچھی حاضری اسلامک پلیٹ فارم پر ہو رہی ہے۔
ایک سال میں 112 افراد حلقہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ پھر تبدیلی ویبسٹر کی ظاہری شکل
صورت میں بھی آ گئی ہے۔ اب اس کے چہرے پر داڑھی بھی ہے جو بھلی معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی
ایک عجیب اتفاق ہے کہ ویبسٹر کی داڑھی اور اس کے عام خط وخال مشہور جرمن مصنف محمد اسد سے
بہت مشابہ ہیں۔

ویبسٹر کے قیام کراچی کے دوران میں نے ایک انٹرویو بھی لیا تھا جسے ہدیہ قارئین کرتا ہوں۔

سوال: سب سے پہلے کیا آپ اس بات پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے کہ آپ نے اسلام
کیوں قبول کیا؟

ویبسٹر: آپ یقین جانیں کہ میرا قبول اسلام میرے لئے ایک ذاتی معجزہ سے کم نہ تھا۔
میں اسے معجزہ کسی عیسائی اثر کی بناء پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ فیصلہ اتنا فوری اور اس درجہ غیر متوقع
تھا کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میرے اسلام لانے میں کسی مسلمان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔
کبھی کسی شخص نے مجھے اسلام کی دعوت نہیں پہنچائی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کبھی کسی مسلمان سے
مجھے ربط ضبط کا موقع ہی نہیں ملا۔ اسلام کی نعمت مجھے اپنی ذاتی جستجو اور تلاش سے حاصل ہوئی اور
ایسے غیر متوقع طور پر حاصل ہوئی کہ میں اسے معجزہ کہنے پر مجبور ہوں دوسروں کے لئے نہیں صرف
اپنے لئے **ذالک فضل الله**

سوال: پھر تو آپ ذرا تفصیل سے بتائیں کہ آپ اسلام کس طرح لائے؟

ویبسٹر: میں لندن کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، میری والدہ بڑی نیک اور
شریف خاتون ہیں اور بچپن میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر اپنی والدہ کا پڑا۔ میں دیکھتا تھا کہ یہ
نیک بی بی ہر اتوار کو گرجا جاتی ہیں اور اپنے تمام معاملات کو سچائی اور انصاف کے ساتھ پورا کرتی
ہیں۔ اپنے محلہ کی تمام خواتین کی ہر ممکن مدد کرتی ہیں، کسی کو دوائی دے رہی ہیں کسی کو نصیحت کر
رہی ہیں، کسی کے کام میں ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے ان کی زندگی ایک اچھی خاتون کی
زندگی تھی اور یہی اقدار میرے دل ودماغ پر رقم ہوگئیں۔ میں نے باقاعدگی سے چرچ جانا شروع
کر دیا اور اپنی ماں کا ہر ممکن تتبع کرنے لگا۔ جب میں دس سال کا تھا اور میرے جذبات بیسائیت
کے لئے بڑے مخلصانہ تھے تو ایک دن میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ "اے مالک حقیقی میں اپنی

زندگی تیرے لئے وقف کرتا ہوں تو میری راہنمائی فرما اور مجھے سیدھا راستہ دکھا''۔ پھر میں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس زمانے میں سالویشن آرمی (Salvation Army) کا بڑا چرچا تھا، میں اس میں شریک ہو گیا اور پوری سرگرمی سے اس کے پروگراموں میں شامل ہونے لگا۔

چند ہی سالوں میں میں نے سالویشن آرمی میں ایسا مقام حاصل کر لیا کہ مجھے اندر سے حالات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ پھر اب میں بچہ بھی نہ رہا تھا اور اپنی عمر کے اٹھارہ سال پورے کر چکا تھا۔

جب میں نے اندر سے حالات کا مطالعہ کیا اور سالویشن آرمی کے کرتا دھرتاؤں کے قریب ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ادارہ تبلیغ کا ادارہ نہیں بلکہ تجارت کا ادارہ ہے وہ حضرات اس میں کھلم کھلا نفاق کی تعلیم دیتے تھے، اس چیز نے میرے جذبات کو شدید دھچکا پہنچایا اور میں سالویشن آرمی کے ڈائریکٹروں سے متنفر ہو گیا اور اس ادارہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔

سالویشن آرمی کو چھوڑ دینے کے بعد بھی عیسائیت پر میرا اعتماد حسب سابق تھا، لیکن اب میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ میں عیسائیت کا مطالعہ کروں اور اس کے نظام فکر و عمل کو سمجھوں۔

عیسائیت کا با قاعدہ مطالعہ میری زندگی کے اس دور کا سب سے تکلیف دہ اور جذبات کش زمانہ تھا۔ جتنا میں اس کا مطالعہ کرتا تھا اتنا ہی میرا اعتماد اس پر متزلزل ہوتا جاتا تھا۔ نئے نئے کانٹے ذہن میں چبھتے تھے۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو زخموں کو مندمل کرتی ''ایک میں تین اور تین میں ایک'' کا عقیدہ ذہن کو سخت پراگندہ کرتا رہا اور حلق سے نہیں اتر پایا۔ یہ تصور کہ ایک شخص کے گناہ کی وجہ سے پوری انسانیت کو سزا دی گئی اور اسے زمین پر پھینک دیا گیا انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے اور پھر یہ نظریہ کہ تمام انسانوں کے گناہوں کی سزا ایک شخص کو دی گئی، دل و دماغ کے لئے اور بھی زیادہ نا قابل قبول تھا۔ میں نے عیسائیت کا مطالعہ اس لئے کیا تھا کہ اپنے عقیدہ کو مستحکم کر کے اس کا مبلغ بنوں گا، مگر جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا پرانے خیالات کا تانا بانا بکھرتا گیا حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا کہ عیسائیت میرے دل کی پکار کا جواب نہیں۔ ذہنی اور علمی حیثیت سے یہ مجھے مطمئن نہیں کر سکتی، اور اس سے بڑھ کر سماجی اور معاشرتی معاملات میں یہ میری کوئی راہنمائی نہیں کر سکتی۔ اسے انسانوں کے حقیقی مصائب سے کوئی سروکار نہیں، معاشی مسائل کا اس

کے پاس کوئی حل نہیں، معاشرتی انصاف سے اسے کوئی علاقہ نہیں، جو مذہب انسان کے مسائل ہی حل نہ کرسکتا ہو آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بالآخر اپنے آبائی خیالات کو میں نے ترک کر دیا اور صرف اپنے آبائی مذہب کو ہی ترک نہیں بلکہ مذہب کو ہی ترک کر دیا۔ میں سوچتا تھا کہ جو مذہب دنیا کے سدھار کے لئے کچھ نہیں کرسکتا تو پھر وہ قطعاً بیکار ہے۔

میرے ذہن کی یہ حالت تھی کہ جب 1921ء میں عظیم معاشی بحران (Great Depression) واقع ہوا لاکھوں افراد بے روزگار ہوئے، ہر طرف غربت اور فقر و فاقہ کا منظر نظر آتا تھا، بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے مگر زمین پر سے روٹی اٹھ گئی تھی۔ روزگار ختم ہو گیا تھا، دلوں کی دنیا لٹ گئی تھی۔ ان حالات نے مجھے سرمایہ داری کا سخت ترین مخالف بنا دیا اور میں انگلستان کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد میں پارٹی ممبر بن گیا اور پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا رہا حتیٰ کہ انگلستان کی مجلس انتظامیہ (Exective Council) کا رکن اور نوجوانوں کی تنظیم کا سیکرٹری بن گیا۔

میں اشتراکیت کے نصب العین میں مگن پارٹی کے لئے ہر قسم کا کام کرتا رہا مگر جوں جوں میں اوپر بڑھ رہا تھا، میں محسوس کر رہا تھا کہ یہاں بھی وہی نفاق ہے جو سالویشن آرمی میں دیکھا تھا۔ عوام کی مشکلات کو ایکسپلائیٹ تو برابر کیا جا رہا تھا، مگر ان سے کوئی حقیقی ہمدردی نہ تھی بلکہ ان کے مسائل کو اور پیچیدہ بنایا جاتا تھا تاکہ سرمایہ داری نظام ناکام ہو اور اشتراکیت کو کام کرنے کا ماحول ملے۔ اس چیز نے مجھے بہت شاک (Shock) کیا۔

پھر دو چیزیں ایسی ہوئیں جنہوں نے مجھے بغاوت پر مجبور کیا، ایک تو روسی کمیونسٹ پارٹی کی مدافعت اور دوسرے نازیوں کے سلسلہ میں کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی۔

مجھے جلد ہی اس چیز کا احساس ہو گیا کہ ملک کی کمیونسٹ پارٹی محض روسی پارٹی کی ایک برانچ ہے، اس کی سفارت ہے، اسے خود کوئی اختیار نہیں اور اس چیز نے میرے ضمیر کو جھنجوڑا۔ دوسری چیز اس پارٹی کی وہ پالیسی تھی جو وہ نازیوں اور لیبر پارٹی کے متعلق اختیار کئے ہوئے تھی۔ کمیونسٹ پارٹی نے کہا کہ لیبر پارٹی نازیوں سے زیادہ گئی گزری ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں ہوسکتا۔ جن ممبران نے لیبر پارٹی کے ساتھ مل کر نازیوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی

تجویز پیش کی تھی ان کو پارٹی سے نکال دیا گیا اور اس مسئلہ پر بڑا ہنگامہ رہا لیکن چند ہی ماہ کے بعد جب مالوٹوف نے کہا کہ نازیوں کے خلاف کمیونسٹ جدوجہد کریں گے تو روس کے اشارہ پر انگلستان کی پارٹی نے اس لیبر پارٹی سے جسے ابھی تک نہ معلوم کیا کیا کہا جارہا تھا مل کر متحدہ محاذ بنایا۔ میں نے اس موقعہ پر مطالبہ کیا کہ جن ممبران کو ہم نے **Expell** کیا تھا ان کو اب واپس لیا جائے کیونکہ وہ صحیح تھے اور ہم غلط، تو نہ صرف یہ کہ اس مطالبہ کو کوئی وزن نہیں دیا گیا بلکہ خود مجھے نکالنے کے مشورے ہونے لگے۔

ان حالات نے مجبور کر دیا کہ میں پارٹی چھوڑ دوں۔

کمیونسٹ پارٹی کو چھوڑنے کے بعد میں نے اشتراکیت اور دوسرے سیاسی نظاموں کا مطالعہ کیا اور اس سلسلہ میں جرمن مفکرین کا بھی مطالعہ کیا۔ میں خاص طور پر فریڈرک نٹشے سے بہت متاثر ہوا۔ وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ کمیونزم کی فکری کمزوریاں بھی میرے سامنے آتی گئیں۔ اور اس کی معاشی تعبیر تاریخ جو اس کی اصل بنیاد ہے کا بودا پن مجھ پر بالکل واضح ہو گیا۔

اس زمانہ میں امپریلزم کے خلاف برابر جدوجہد کرتا رہا اور اس سلسلہ میں ایک پارٹی بھی قائم کی۔

جنگ کے زمانے میں میں نے جنگ کی مخالفت کی۔ اس لئے نہیں کہ میں جنگ کو برا سمجھتا تھا بلکہ اس لئے کہ یہ جنگ محض استعماری طاقتوں کے درمیان استعماری مقاصد کے لئے ہو رہی تھی اور اس کا اصل نقصان صرف کمزور ممالک کو پہنچ رہا تھا۔ میری ان سرگرمیوں کی بنا پر مجھے گرفتار کر لیا گیا اور جب رہا کیا گیا تو مجھے انگلستان چھوڑنا پڑا۔

اب میں آسٹریلیا آ گیا میرا مطالعہ برابر جاری تھا اور اشتراکی فکر کو ترک کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مذہب انسان کے لئے بیکار نہیں۔ مذہب کو محض مابعد الطبیعیاتی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ایک نظام حیات دینا چاہیے اور ایسے اصول اور ایسے اداروں سے مسلح ہونا چاہیے جو معاشرے کو سنواریں اور زمین پر انصاف قائم کرنے کا موجب ہوں۔

آسٹریلیا میں بھی میری سامراج دشمن سرگرمیاں جاری رہیں۔ ہم جلسے کرتے تھے، پمفلٹ چھاپتے تھے اور اگر ضرورت ہوتی تو مخالفین کے خلاف پکٹنگ کرتے تھے اور انہیں تقاریر نہیں کرنے دیتے تھے۔

اس زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے میری دنیا ہی بدل دی۔ ہوا یہ کہ پرتھ یونیورسٹی میں

انڈونیشیا کا سفیر شمالی آریان کے مسئلہ پر تقریر کرنے آیا۔ آسٹریلیا میں انڈونیشیا کے اس مطالبہ کو ایک سامراجی مطالبہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگ وہاں پہنچے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ تقریر نہ ہو سکی۔ انڈونیشی سفیر بڑی خاموشی اور وقار کے ساتھ واپس چلا گیا۔

لیکن اس واقعہ نے مجھ پر دو اثر چھوڑے۔

پہلا یہ کہ جب ہم جمہوریت اور آزادی کے علمبردار بن گئے ہیں تو ہم نے آخر اس شریف آدمی کو یہ موقع کیوں نہیں دیا کہ وہ اپنا نقطہ نظر بیان کرے۔ ہم اس پر تنقید کر سکتے تھے مگر ہم نے اسے آخر بولنے سے کیوں روکا؟ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے۔

دوسرا یہ کہ اصل مسئلہ ہے کیا؟ اور یہ کیا بنیاد ہے کہ چونکہ وہاں کی آبادی مسلمان ہے اس لئے اسے ہمارے ساتھ ہونا چاہیے اور یہ کہ مسلمانوں کے عقائد کیا ہیں؟ ان کا مذہب کیا ہے؟ یہ سوالات میرے ذہن میں ابھرے اور میں نے مسلمانوں کے حالات اور ان کے مذہب کو پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔

اسی زمانے میں مصر نے سوئز کو نیشنلائیز کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ فیصلہ امپریلزم پر ایک ضرب کاری تھا اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔ پھر میں نے سوچا کہ ناصر مسلمان ہے اور مسلمان امپریلزم کے خلاف لڑ رہے ہیں اور اس بات نے اسلام میں میری دلچسپی کو بڑھا دیا۔ میں اسلام پر کتابوں کی تلاش میں نکلا اور بک سٹال پر میری نظر ایک کتاب پر جم گئی۔ Road to Mecca میں نے کتاب خرید لی۔ اور اس کو حرف بہ حرف پڑھا اسے پڑھ کر میں اسلام کے بہت قریب آ گیا۔

اب میں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا۔

یونیورسٹی لائبریری سے میں نے ایک انگریز کا ترجمہ لیا، لیکن اس کے پہلے ہی صفحے پر پیغمبر اسلام پر اعتراض تھا۔ میں نے اسے بند کر دیا کہ جو شخص کتاب کا آغاز ہی اعتراض سے کرتا ہے اس کا ترجمہ قابل اعتماد نہیں ہو سکتا۔ پھر میں نے لائبریرین سے کہا کہ ایسا ترجمہ دو جو کسی مسلمان نے کیا ہو۔ بڑی محنت کے بعد مجھے ایک ترجمہ ملا۔ محمد علی کا اور میں نے اس کا مطالعہ باقاعدگی سے کیا۔

پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کیا اور مجھے اس عظیم انسان کی زندگی نے بڑا متاثر کیا۔ حضرت عیسیٰ کے مقابلے میں آپ کی پوری زندگی محفوظ تھی۔ یہ زندگی بڑی صاف، بڑی پاکیزہ، بڑی متاثر کن تھی۔ یہ شخص جو کہتا تھا اس پر عمل کرتا تھا۔ اس کے دوست اس کے جانثار اور

اس کے دشمن اسے امین کہتے تھے، اس کا کردار ہر شبہ سے بالا تھا، اس کی سچائی روز روشن کی طرح ظاہر تھی۔

میں نے پڑھا کہ چالیس سال کی عمر میں اس شخص پر وحی کی گئی۔ فرشتے نے اسے کہا کہ پڑھ۔

اس نے جواب دیا! میں ان پڑھ ہوں کیسے پڑھ سکتا ہوں۔ کتنا سچا تھا یہ انسان۔

وحی کے اس واقعہ کو آ کر اس نے اپنی زوجہ کو بتایا۔ اس کی بیوی کا پہلا ردعمل یہ تھا۔ "آپ اطمینان رکھیں اور گھبرائیں نہیں۔ آپ نے کبھی کسی سے برائی نہیں کی، آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ آپ پر اللہ کا فرشتہ ہی نازل ہوا ہوگا"۔ ظاہر ہے بیوی ایک ایسی ہستی ہے جس سے انسان اپنا کوئی عیب چھپا نہیں سکتا۔ وہ ظاہر و باطن سب سے واقف ہوتی ہے۔ جس شخص پر سب سے پہلے اس کی بیوی ایمان لائی، وہ یقیناً نہایت سچا آدمی ہی ہوسکتا ہے۔

پھر میں نے اس شخص کی تعلیم میں دنیا کے مسائل سے دلچسپی اور ان کو حل کرنے میں قوت بھی دیکھی۔ وہ زندگی سے کاٹتا نہیں، زندگی کو سنوارتا ہے۔ وہ معاشرتی اور تمدنی معاملات میں رہنمائی دیتا ہے اور ایک نئی تہذیب قائم کرتا ہے۔

جب میں نے اس عظیم شخص کی زندگی کا مطالعہ مکمل کرلیا تو میرے دل سے خود بخود ہی یہ آواز نکلی۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

جب میں یونیورسٹی لائبریری سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا اور پہلی مرتبہ دیکھا حالانکہ میں اس سڑک سے بار بار گزر چکا تھا کہ قریب ہی ایک مسجد ہے جس پر **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** لکھا ہوا ہے۔ مسجد کا اس طرح میری آنکھوں کے سامنے ہونا ایک معجزہ تھا۔ میں اس میں داخل ہوا اور میں نے اعلان کیا۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یہ ہے میرے قبول اسلام کی داستان۔

سوال: عالم اسلام کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ جن حالات میں آج کل مسلمان گھرے ہوئے ہیں ان کے متعلق آپ کا تجزیہ کیا ہے؟

جواب: ان حالات کے متعلق میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر عالم اسلام کو دیکھ کر میرے

اسلام لانے کا سوال ہوتا تو میں کبھی مسلمان نہ ہوتا۔ مسلم دنیا میں آج کوئی ایسی چیز نہیں جو قبول اسلام کی تحریک کرتی ہو اور یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال ہے۔

میں نے ہندو پاکستان کا بڑی تفصیل سے دورہ کیا ہے۔ عرب ممالک کے مسلمانوں سے لندن میں ملنے اور ان کے حالات کو سمجھنے کے موقعہ ملا ہے۔ افسوس مسلمان ان تمام خوبیوں کو چھوڑ چکے ہیں یا چھوڑتے جا رہے ہیں جو اسلام نے ان کو سکھائی تھیں بلکہ آپ یقین کریں کہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یورپ لادین یورپ کئی حیثیتوں سے مسلمانوں سے زیادہ مسلمان ہے۔ اسلام نے ہمیں صفائی اور طہارت کی تعلیم دی، مسلمانوں کو صفائی اور حفظان صحت کا کچھ خیال نہیں۔ اسلام ہر حال میں وعدے کے ایفاء کی تعلیم دیتا ہے، مسلمان کو آج عہد کا کوئی پاس نہیں۔ اسلام وقت کی پابندی کا مطالبہ کرتا ہے، ہمارے یہاں آج پاکستان میں ٹائم کے معنی وقت مقررہ سے دو گھنٹے پہلے یا دو گھنٹے بعد کے ہیں۔ اسلام حرکت اور عمل کی ترغیب دیتا ہے اور مسلمان آج بیٹھے بیٹھے انشاء اللہ اور ماشاء اللہ کہتے رہتے ہیں۔ یہ الفاظ ان کی نگاہ میں آج محض دو بغیر معنی کے بول بن کر رہ گئے ہیں جب وہ انشاء اللہ کہتے ہیں تو کبھی سوچتے نہیں کہ اللہ کی منشاء کیا ہے اور اس نے اس کے پورا کرنے کا کیا راستہ بتایا ہے۔ جب وہ ماشاء اللہ کہتے ہیں تو یہ خیال ان کو نہیں آتا ہے کہ کامیابی کا ایک ایک طریقہ بھی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے۔

مختصراً ہمارے تین بڑے طبقے ہیں اور تینوں کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہیں۔ عوام جہالت کا شکار ہیں۔ ان کے سامنے نہ کوئی مقصد ہے اور نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ علماء دین کے حقائق سے کٹ گئے ہیں اور بسم اللہ کے گنبد میں محصور ہیں (Nory Towor of Solvation) جب کہ متوسط کاروباری طبقہ توہمات کا شکار ہے۔ وہ اسلام اور اس کے مطالبات کا کوئی واضح نقشہ اپنے سامنے نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم عدم توازن اور بے اعتدالی کا شکار ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تینوں طبقات میں پورا پورا تعاون ہو اور ہر ایک اپنا اپنا کردار بہتر انداز میں ادا کرے تا کہ تعمیر و ترقی رونما ہو سکے۔

سوال: مسٹر ویبسٹر حالات واقعی مایوس کن ہیں، لیکن کیا آپ کو امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے؟

جواب: یقیناً اول تو اسلام اللہ کا دین ہے اور اس کی ترقی اور ترویج کے لئے وہ خود بندوبست کرتا ہے۔ اگر آج کے مسلمان اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کریں گے تو وہ کسی اور قوم کو اس

کا علمبردار بنادے گا تاکہ وہ اس کی حقیقی خدمت انجام دے۔ تاریخ ہماری محتاج نہیں۔ ماضی میں بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں سے کام لیا اور مستقبل میں بھی وہ ایسا انتظام کر سکتا ہے۔ چنانچہ حالات کی سنگینی کے باوجود میرے نزدیک مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

پھر عالم اسلام میں بھی امید کی ایک کرن نظر آ رہی ہے اور وہ جدید احیائی تحریکات ہیں۔ اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی اس سلسلے میں بڑی اہم ہیں۔ ان تحریکات کے قایدین سے مل کر میں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام کا حقیقی تصور پیش کر رہی ہیں۔ اسلامی ریاست کے ارتقاء کی جس نہج کو وہ پیش کر رہی ہیں وہ بڑا امید افزا ہے لیکن ان تحریکات کے متعلق جو چیز کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پروگرام میں تعلیمی اور عوامی کام اور سیاسی کام میں توازن قائم نہیں رکھا اور سیاست پر Emphasis کی وجہ سے بہت سی دوسری ضروری چیزیں پوری نہیں ہو سکی ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں مسلمانوں کا رویہ مغرب کے بارے میں کیا ہونا چاہیے؟

جواب: مغرب مادیت اور الحاد کا علمبردار ہے۔ اسلام کو اس سے کوئی علاقہ نہیں۔ مغرب سامراج اور امپریلزم کا حامی ہے۔ اسلام ان کا دشمن ہے۔ اسلام زندگی کو اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر قائم کرتا ہے، وہ ترقی کا مخالف نہیں اس کی صحیح نہج کو متعین کرتا ہے۔ اس میں رہبانیت نہیں ہے، تصوف نہیں ہے، تو ہم نہیں ہے۔ اسلام تو زندگی کا سیدھا راستہ ہے جو روحانی اور اخلاقی دونوں قسم کی ترقی چاہتا ہے۔ میرے خیال میں مسلمانوں کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے کلچر پر قائم رہیں اور اس کو مستحکم کریں۔ مغربی کلچر، مغربی تہذیب، مغربی اصولوں کو اختیار کرنا ہمارے لئے مہلک ہوگا۔ ہماری ترقی مغرب کی نقالی میں نہیں اپنے طریقہ کے اتباع میں ہے۔

پھر مغرب خود اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہے اور جو خود دیوالیہ ہو وہ دوسروں کی رہنمائی کیا کرے گا؟ حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا کہ اگر ایک اندھا دوسرے کی رہبری کرے گا تو دونوں گڑھے میں گریں گے۔

ہمارے پاس اسلام کی روشنی موجود ہے پھر ہم بصیرت سے محروم یورپ کی تقلید کیوں کریں۔ لیکن کچھ چیزیں ہیں جن میں ہم یورپ سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً عمل اور جدوجہد کا جذبہ، صحت وصفائی کے اصول، سائنسی ترقی ...... ان تمام چیزوں کو جو دراصل اسلام ہی سے مستعار ہیں ہم اختیار کر سکتے ہیں اور اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔

اطلاع، لوح محفوظ اور ڈی این اے

ہارون یحییٰ

اطلاع (انفارمیشن)..... نصف صدی پہلے کے مقابلے اب کئی گنا زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ سائنس دان ''اطلاع'' کی وضاحت کے لئے کئی نظریات پر کام کر رہے ہیں۔ سماجی سائنس دان ''اطلاع کے عہد'' کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ اطلاع اب انسانیت کے لئے بہت اہمیت حاصل کر گئی ہے۔

کائنات اور بذات خود حیات کی ابتداء میں اطلاع کی دریافت آج کے جدید دور میں بڑی اہمیت حاصل کر گئی ہے۔ سائنس دان اب اس حقیقت کو ماننے لگے ہیں کہ ہماری کائنات ''مادے، توانائی اور اطلاع'' سے وجود میں آئی ہے۔ یہ انیسویں صدی کے مادہ پرستی کے فلسفے کی جگہ لے رہی ہے جو کہتا تھا کہ پوری کائنات صرف ''مادے اور توانائی'' سے ہی وجود میں آئی ہے۔

تو آخر ان سب کا کیا مطلب ہے؟

چلئے پہلے ڈی این اے کی مثال لیتے ہیں۔ تمام زندہ خلیات دوہری چکردار ساخت والے ڈی این اے میں موجود ''جینیاتی اطلاعات'' کے ذریعے اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ ہمارا جسم کھربوں خلیات سے مل کر بنا ہے اور ہر خلیہ اپنا جداگانہ ڈی این اے رکھتا ہے۔ جسم کے تمام افعال اسی بڑے سارے سالمے میں درج ہوتے ہیں۔ ڈی این اے میں چھپے کوڈ استعمال کرتے ہوئے ہمارے خلیات نئے پروٹین تیار کرتے ہیں۔ ہمارے ڈی این اے میں تحریر، ہدایات و اطلاعات اس قدر زیادہ ہیں کہ انہیں لکھنے بیٹھیں تو انسائیکلوپیڈیا کی 900 جلدیں اول تا آخر بھر جائیں!

آخر ڈی این اے کس سے بنا ہے؟ پچاس سال قبل سائنس دانوں کا جواب تھا کہ ڈی این اے نیوکلیائی ترشوں سے بنتے ہیں جنہیں نیوکلیوٹائڈز کہتے ہیں۔ ان نیوکلیوٹائڈز کو کیمیائی بند (بونڈ) آپس میں جوڑے رکھتے ہیں۔ آسان زبان میں انہوں نے صرف ان مادی عناصر کا ذکر کیا جو بظاہر ڈی این اے میں نظر آتے ہیں۔ مگر آج کے سائنس دانوں کا جواب قدرے مختلف ہوگا، مثلاً ڈی این اے ایٹم، سالمات، کیمیائی بند اور سب سے بڑھ کر ''اطلاع'' پر مشتمل ہوتا

ایک کتاب کی طرح ہوتا ہے۔

ہے..... مگر یہ کہنا بہت بڑی غلطی ہے کہ ایک کتاب صرف کاغذ، سیاہی اور جلد بندی جیسے اجزاء کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ کتاب میں معلومات (اطلاعات) اسے حقیقتاً ایک کتاب بناتی ہیں معلومات ہی ہیں جو "انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا" کو ایک "کتاب" کا درجہ دے کر اس کتاب سے ممتاز کرتی ہیں جس میں ABZDLXYPPLGSO کی طرح بے ترتیب الفاظ تحریر ہوتے ہیں۔ بظاہر دونوں میں ہی صفحات، سیاہی اور جلد موجود ہے۔

مگر ایک میں اطلاع ہے اور دوسری کتاب میں بے ہنگم الفاظ اور یوں اول الذکر کو کتاب کہیں گے جبکہ دوسری کتاب نہیں کہلائے گی۔ اس اصلی کتاب میں اطلاع کا مخزن مصنف کا باشعور دماغ ہی ہے۔ اسی لئے ہم ڈی این اے میں موجود تحیر انگیز اطلاع کو دیکھ کر یہی کہیں گے کہ اسے کسی ذہین اور اعلیٰ ہستی نے ہی مرتب کیا ہے۔

مادہ پرستی اور نظریہ ارتقاء میں اطلاع کی بند گلی

اس دریافت نے ڈارونزم اور مادہ پرستی کے فلسفے کو اور فطری سائنس میں ان کے اطلاقات کو ایک بند گلی میں پہنچا دیا ہے۔ مادہ پرستی کا مفروضہ کہتا ہے کہ تمام زندہ اشیاء صرف مادے سے ہی بنی ہیں اور یہ کہ جینیاتی معلومات "بس یونہی" اور اتفاقیہ وجود میں آئی ہیں۔ یہ کہنا ایسا ہی ہے کوئی کتاب محض الفاظ کی گڑبڑ، کاغذ، سیاہی اور دیگر اجزاء کی بے ترتیبی سے ایک ترتیب میں پیدا ہوگئی ہے۔ اور ایک قابل فہم کتاب وجود میں آگئی ہے۔

مادہ پرست حضرات "تخفیف" (Reductionism) کا عمل مستعار لیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اطلاع کو منہا کرتے جائیں تو آخر میں مادہ ہی بچ رہتا ہے۔ اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ مادے کو اطلاع کے لئے دیکھنا درست نہیں ہے۔ مگر اب ثابت ہوگیا ہے کہ یہ طرز فکر بالکل غلط ہے۔ حتیٰ کہ اب مادہ پرستی کے حلقے بھی اسے اپنا رہے ہیں۔

جارج سی ولیمز، جو نظریہ ارتقاء کے پرجوش حامی ہیں 1995ء کے ایک مضمون میں مادہ پرستی (عمل تخفیف) کی اغلاط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ارتقائی حیاتیات دان یہ سمجھنے میں ناکام ہو چکے ہیں کہ دو مختلف چیزوں کو ایک کیا گیا ہے: اول اطلاع، دوم مادہ.... ان دونوں اشیاء کو کسی بھی طرح ان معنوں میں ایک نہیں کیا جا سکتا جے

"عمل تخفیف" کہتے ہیں۔ جین اطلاع کا پٹارا ہے محض کوئی مادی شے نہیں ہے۔ جب حیاتیات میں آپ جین، جینوٹائپ یا جین پول کی بات کرتے ہیں تو درحقیقت آپ اطلاع کا ذکر کررہے ہوتے ہیں نہ کہ کسی طبیعی حقیقت کا..... ان مختلف وضاحتوں کے تحت مادہ اور اطلاع دو مختلف اشیاء ہیں۔ اسی لئے ان پر ان کے مفہوم میں علیٰحدہ علیٰحدہ گفتگو کی جانی چاہیے"۔

کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفہ سائنس سے وابستہ اسٹیفن سی میٹر جو نظریہ ارتقاء اور مادہ پرستی کے شدید ناقد ہیں، اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

"میں کمرہ جماعت میں طالب علموں کے سامنے اس کی وضاحت کے لئے یہ طریقہ اختیار کرتا ہوں۔ میں دو کمپیوٹر ڈسک ہاتھ میں لیتا ہوں، ایک میں سافٹ ویئر ہوتا ہے اور دوسری بالکل خالی ہوتی ہے۔ پھر میں طالب علموں سے سوال کرتا ہوں۔ "ان دونوں ڈسک میں اطلاع کے فرق کے باعث ان کی کمیت پر کیا کوئی فرق پڑا ہے؟" ظاہر ہے جواب نفی میں آتا ہے۔ اطلاع سے اس (کمیت) پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اطلاع بے کمیت ہوتی ہے۔ اطلاع کی کوئی مادی اکائی نہیں ہوتی"۔

پھر کوئی مادہ پرستانہ وضاحت اپنا (مادے کی) آغاز کیونکر بیان کرسکتی ہے۔ صرف مادہ، اپنے نقطہ آغاز کی تشریح کیسے کرسکتا ہے۔ یہی بات مادہ پرستانہ ارتقائی مفروضے کے لئے بنیادی چیلنج کی مانند ہے۔

انیسویں صدی میں، ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ سائنس کی دو بنیادی اکائیاں ہیں، یعنی مادہ اور توانائی۔ اب اکیسویں صدی کے آغاز پر ہم تیسری اکائی کو جان گئے ہیں جو اطلاع ہے۔ اسے تخفیفی عمل سے گزار کر نہ ہی مادے تک پہنچایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی حتمی منزل توانائی ہے۔ بیسویں صدی کے وہ تمام نظریات جن کے ذریعے اطلاع کو تخفیف کرکے مادے کی مانند زندگی کے بے ترتیب آغاز، مادے کی ازخود تنظیم، حیاتیاتی ارتقاء جن کے ذریعے قدرتی انتخاب اور تبدیلی کے ذریعے انواع میں جینیاتی اطلاع کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی، یہ سب ناکام ہوگئے۔ ڈارونزم پر ایک اور ممتاز نقاد، پروفیسر فلپ جانسن کہتے ہیں:

"مادے اور اطلاع کا دوہرا پن ہی ہر درجے کی حیاتیات کا حقیقی دوغلا پن ثابت ہوا ہے۔ دماغی سائنس کے ماہرین اطلاع کی حقیقت جاننے میں ناکام رہے ہیں کیونکہ وہ دماغ کو مادے

کے سوا کچھ نہیں سمجھتے (یہی ڈاروِنزم ہے)۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ مادے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ محض ایک مفروضہ ہے جسے غیر روایتی سوچ کے ذریعے ختم کرنے کی ضرورت ہے"۔

جیسا کہ جانسن نے کہا "اطلاع مادہ نہیں ہے، بلکہ یہ مادے پر ثبت ہوتی ہے۔ پھر یہ (اطلاع) کہیں اور سے آئی ہے"۔ اسی طرح جرمن فیڈرل انسٹی ٹیوٹ آف فزکس کے صدر اور پروفیسر ڈاکٹر ورنر گٹ کہتے ہیں:

"کوڈنگ کا نظام ہمیشہ غیر مادی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ طبیعی مادہ اطلاع کے رموز (کوڈ) نہیں بنا سکتا۔ تجربات یہی بتاتے ہیں کہ تخلیقی اطلاع سے مزین ایک ایک حصہ ذہنی مشقت کو بیان کرتا ہے۔ یہ ہمیں ایک ایسی ہستی کی جانب لے جاتے ہیں جو ہر شے پر قادر ہے اور بھرپور ذہانت رکھتی ہے..... فطرت کا کوئی معلومہ نظریہ، کوئی عمل اور واقعات کا کوئی سلسلہ مادے کو خود بخود اطلاع پیدا کرنے کے قابل نہیں بنا سکتا"۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ایک کتاب، کاغذ، سیاہی اور اطلاع پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان اطلاعات کا ماخذ مصنف کا دماغ ہوتا ہے۔ یہاں ایک نکتہ اور بھی ضروری ہے۔ یہ دماغ ہی ہے جو مادے کے درست استعمال پر غور کرتا ہے۔ کوئی کتاب پہلے مصنف کے دماغ میں جنم لیتی ہے۔ پہلے الفاظ پھر جملے وجود میں آتے ہیں۔ بعدازاں، دوسرے مرحلے میں وہ ان خیالات کو مادی شکل دیتا ہے۔ کمپیوٹر یا ٹائپ رائٹر استعمال کرتے ہوئے وہ ذہن میں موجود اطلاع کو الفاظ میں ڈھالتا ہے۔ یہ الفاظ پرنٹنگ پریس میں جا کر کتاب کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

اب یہاں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر مادے میں اطلاع ہوتی تو وہ ان اطلاع کے تحت خود بخود منظم ہو جاتا جو دماغ میں ہوتی ہے۔ پہلے دماغ ہوتا ہے پھر دماغ ان اطلاع کو مادے پر منتقل کرتا ہے اور یوں ایک ڈیزائن ہوتا ہے"۔

مادے سے پہلے وجود رکھنے والا ذہن

جیسا کہ مادہ پرست دعویٰ کرتے ہیں، فطرت میں اطلاع کا منبع از خود مادہ نہیں ہو سکتا۔ اطلاع کا وسیلہ مادہ نہیں ہے بلکہ ایک اعلیٰ ذہن ہے۔ ذہن مادے سے پہلے وجود رکھتا ہے۔ پھر ذہن مادے کو تخلیق کر کے شکل دیتا ہے اور پوری مادی کائنات کی صورت میں اسے منظم کرتا ہے۔ صرف حیاتیات ہی سائنس کی وہ شاخ نہیں ہے جو ہمیں اس نتیجے لے جاتی ہے۔ بیسویں

صدی کی طبعیات اور فلکیات بھی فطرت میں عظیم صورت گری، توازن اور ہم آہنگی کی گواہی دے رہی ہیں۔ یہ اسی عالمی ذہن کی جانب اشارہ ہے جو کائنات سے بھی پہلے موجود تھا اور جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔

اسرائیلی سائنس دان جیرالڈ شروڈر جو ایم آئی ٹی جیسے ممتاز اداروں سے فارغ التحصیل ہیں اور "خدا کی سائنس" نامی کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ وہ بھی اسی موضوع پر اہم دلائل دیتے ہیں۔ ان کی نئی کتاب "خدا کا پوشیدہ چہرہ۔ سائنس حتمی سچ سے پردہ اٹھاتی ہے" میں وہ سالماتی حیاتیات اور مقداری طبعیات (کوانٹم فزکس) کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک واحد شعور، ایک عالمگیر حکمت نے کائنات کو جنم دیا ہے۔ سائنس کی دریافتیں جو ذیلی جوہری مادے کی کوانٹم فطرت ہمیں شعور کی اس نہج پر لے جاتی ہے جہاں ہم مان لیتے ہیں کہ تمام موجود اشیاء اسی کی حکمت کا اظہار ہیں۔ تجربہ گاہوں میں ہم اسے (مادے کو) ایسی اطلاع قرار دیتے ہیں جسے پہلے طبیعی صورت یعنی توانائی میں ڈھالا اور پھر مادے کی صورت دی گئی ہے۔ ہر ذرہ، ہر شے، خواہ وہ ایٹم ہو یا انسان، اطلاع کے کسی نہ کسی درجے پر اس کی حکمت و عقل کی جانب اشارہ کرتا ہے"۔

شروڈر کے مطابق ہمارے دور کے سائنسی نتائج اور مذاہب کے ڈانڈے ایک مشترکہ سچائی پر ملتے ہیں۔ یہی تخلیق کی سچائی ہے۔ اب سائنس حق کو ازسرنو دریافت کر رہی ہے جو مذہب کئی ہزار سال پہلے سے انسانیت کو سکھاتا چلا آ رہا ہے۔

لوح محفوظ

اب تک ہم نے کائنات اور جانداروں کی پیدائش پر سائنس کے نتائج ملاحظہ کئے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام کائنات اور حیات عظیم اطلاع کے اس اہم نقشے کے تحت پیدا کی گئی ہے جو پہلے سے ہی موجود تھا۔

جدید سائنس اب جس حیرت انگیز نتیجے پر پہنچی ہے وہ چودہ سو سال قبل ہی قرآن عظیم میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل کی گئی ہے۔ اللہ نے لوح محفوظ کا اعلان کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی فرما دیا تھا اور یہ کہ کائنات میں ہر شے کی تخلیق اور واقعات کی تعبیر پہلے سے ہی بیان کر دی گئی ہے۔

لوح محفوظ کا تحفظ (محفوظ) کیا گیا ہے، اسی لئے اس میں تحریر ہدایات نہ ہی بدل سکتی ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ اسے قرآن "ام الکتاب" یعنی تمام کتب کی ماں قرار دیتا ہے۔ اسی طرح کتاب حافظوں (محفوظ کتاب) کتاب مکنون (اچھی طرح محفوظ کردہ کتاب) یا پھر صرف کتاب کے الفاظ سے پکارا ہے۔ اسے کتاب من قبلی (یعنی کتاب فرمان) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ انسانیت کو پیش آنے والے اگلے تمام واقعات و معاملات اسی میں درج ہیں۔

کئی آیات مبارکہ میں اللہ رب العزت، لوح محفوظ کی خصوصیات بیان کرتا ہے۔ پہلی ماہیت یہ ہے کہ اس میں ہر شے موجود ہے اور کوئی بھی شے اس سے باہر نہیں ہے:

(ترجمہ) "اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں (خزانے) ان کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ کے۔ اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں"۔ (سورۃ 6۔ آیت 59)

ایک اور آیت مبارکہ میں بیان ہوا ہے کہ تمام جہان کی زندگی کا ریکارڈ لوح محفوظ میں درج ہے: (ترجمہ) "اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنے قسم کے پرند جانور ہیں اور کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں، ان کی کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تمہاری طرح گروہ نہ ہوں، ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی، پھر سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کئے جائیں گے"۔ (سورۃ 6۔ آیت 38)

ایک دوسری آیت میں بیان ہے کہ جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے، تمام جاندار اور اشیاء خواہ وہ ریت کا حقیر ذرہ ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ سے پوشیدہ نہیں اور لوح محفوظ میں درج ہے:

(ترجمہ) "اور آپ کے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی اور نہ کوئی بڑی، مگر یہ سب کتاب مبین میں ہے"۔ (سورۃ 10۔ آیت 61)

تمام انسانیت کو درپیش ساری معلومات بھی لوح محفوظ میں درج ہیں۔ ان میں تمام انسانوں کا نینیاتی کوڈ بھی تحریر ہے اور ان کی قسمت بھی:

(ترجمہ) "بلکہ انہیں تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک آگاہ کرنے والا آیا تو

کافروں نے کہا کہ یہ ایک عجیب چیز ہے۔ کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے، پھر یہ واپسی دور (از عقل) ہے۔ زمین جو کچھ ان میں سے گھٹاتی ہے وہ ہمیں ہے اور ہمارے پاس سب یاد رکھنے والی کتاب ہے"۔ (سورۃ 50۔ آیات 2 تا 4)

درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے کہ لوح محفوظ میں درج ارشادات خداوندی حرف آخر ہیں۔ جسے اس مثال کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے:

(ترجمہ) "روئے زمین کے (تمام) درختوں کے اگر قلمیں ہو جائیں اور تمام سمندروں کی سیاہی ہو اور ان کے بعد سات سمندر اور ہوں تا ہم اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے، بے شک اللہ تعالیٰ غالب اور با حکمت ہے"۔ (سورۃ 31۔ آیت 27)

حرف آخر

اس مضمون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کو دیئے جانے والے مذہبی تصورات کی جدید سائنس تصدیق کرتی ہے۔ دراصل مادہ پرستی کا فلسفہ جو ایک عرصے سے سائنس پر حاوی تھا اسے خود سائنس رد کر رہی ہے۔

جدید سائنس اب اس مسئلے کو بھی حل کر رہی ہے جو ہزاروں برس سے تنازعے کا باعث بنا ہوا تھا۔ یہ معرکہ مذہب اور مادہ پرستی کے فلسفے کے درمیان جاری تھا۔ مادہ پرست حلقے اب بھی اس بات پر مصر ہیں کہ کائنات کی کوئی ابتداء نہیں اور مادے سے پہلے کچھ بھی موجود نہ تھا۔ جبکہ دوسری جانب مذہب کہتا ہے کہ جب مادہ نہیں تھا تب بھی خدا موجود تھا اور ہے۔ خدا نے ہی مادے کو تخلیق کیا ہے۔

یہ حقیقت اسلام، عیسائیت اور یہودیت، تمام مذاہب سے ثابت ہے۔ اب تاریخ کے اس لمحے پر یہ سچائی جدید سائنس سے ثابت ہو چکی ہے۔ یہ اس جانب اشارہ ہے کہ اب الحاد کا خاتمہ قریب ہے۔ درج ذیل آیت مبارکہ میں بھی لوگوں کو یہی بات یاد دلائی گئی ہے:

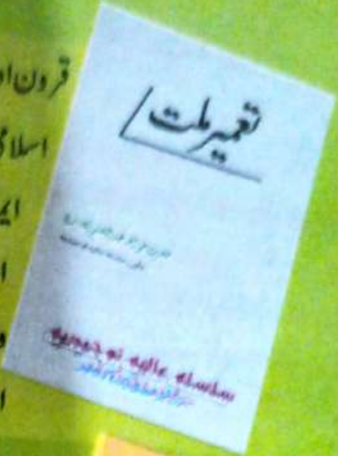
(ترجمہ) "کیا آپ نے نہیں جانا کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے۔ یہ سب لکھی ہوئی کتاب میں محفوظ ہے۔ اللہ پر تو یہ امر بالکل آسان ہے"۔ (سورۃ 22۔ آیت 70)

بشکریہ گلوبل سائنس

زندگی اور موت کا سوال

- جب ہمارا دین مکمل، ہمارا نبی ﷺ برحق اور ہمارا قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملت اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟
- جب اللہ تعالےٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے اور یہ بھی کہ اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ تو پھر ہم اسقدر مغلوب بے بس اور رسوا کیوں ہیں؟
- مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس بھی خوب شاندار طریقہ سے مناتے ہیں۔ ماہ محرم میں بھی کیا جوش وخروش ہوتا ہے۔ مالدار بھی بہت ہیں اور لاکھوں لوگ کوٹھیوں، کاروں اور کارخانوں کے مالک ہیں تو پھر یہ مردنی کیوں ہے اور یہ تنزل کیوں ہو رہا ہے؟
- ہر طاقتور ملک کی نظریں ہمارے ملکوں پر کیوں لگی ہیں اور ہر طرف خون مسلم اسقدر بے دردی اور ارزانی کے ساتھ کیوں بہایا جا رہا ہے؟
- نکبت وادبار کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور کونسے لائحۂ عمل پر چل کر ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف



قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل



کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔



کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔